گوشہ بیاد مولانا ڈاکٹر نذیر احمد ندویؒ

TAMEER-E-HAYAT

ISSN - 2582-4619 - VOL 62 - ISSUE 24 - 25 OCTOBER 2025

تعمیرِ حیات

لکھنؤ

پندرہ روزہ

میرے بعد تم کس کی عبادت کروگے؟

اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہ ملت کے لیے صرف ایک پوسٹر بنانا ہے، اور صرف ایک جملہ کی گنجائش ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں، تو میں کہوں گا کہ ”ماتعبدون من بعدی“ لکھ دو، پوسٹر کے نیچے لکھو کہ ہر مسلمان اپنی اولاد سے دنیا سے جانے سے پہلے سوال کرے اور جب تک دنیا میں ہے اپنا جائزہ لے، محاسبہ کرے کہ اس کے نزدیک اس کی اہمیت ہے یا نہیں؟ وہ اپنے بچوں کے لیے، اپنی آئندہ نسل کے لیے یہ اطمینان کرنا ضروری سمجھتا ہے یا نہیں کہ ”ماتعبدون من بعدي“ ”میرے بعد تم کس کی عبادت کروگے؟ میں آپ سے کہتا ہوں کہ ہم اور آپ سب اپنے اپنے دلوں کو ٹٹولیں اور یہ دیکھیں کہ واقعی اس سوال کی ہمارے یہاں اہمیت ہے یا نہیں؟ اور یہ سوال افراد کے پیمانہ پر، خاندان کے پیمانہ پر، برادری کے پیمانہ پر، معاشرہ کے پیمانہ پر، محلہ کے پیمانے پر، قصبہ کے پیمانہ پر اور آخر میں میں کہتا ہوں کہ ملت کے پیمانہ پر، اور ملت ہندیہ اسلامیہ کے پیمانہ پر، ہمارے دلوں پر نقش ہے یا نہیں؟ ہماری آئندہ نسل ہمارے بعد کس راستے پر چلے گی؟ وہ کس گروہ وملت کی پیرو ہوگی؟ کس کی پرستش کرے گی؟ کن عقائد کو مانے گی؟ .... یہ خدائے واحد کی پرستار ہوگی یا سیکڑوں، ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں، خداؤں اور دیوتاؤں کی؟ یہ اس وسیع کائنات میں اور اپنی محدود زندگی میں کس کے دست قدرت کو کام کرتا ہوا دیکھے گی اور مانے گی؟۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

سالانہ زرتعاون ₹500

۲۵/ اکتوبر ۲۰۲۵ء

فی شمارہ ₹25/-

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پندرہ روزہ تعمیرِ حیات لکھنؤ

ISSN 2582-4619

جلد نمبر ۶۲ — ۲۵ ر اکتوبر ۲۰۲۵ء مطابق ۲ ر جمادی الاول ۱۴۴۷ھ — شمارہ نمبر ۲۴

اس شمارے میں

ندوہ کا مطلوب	محمد عمیر الصدیق ندوی	۴
مردِ مومن کی نشانی	عبد الرشید راجستھانی ندوی	۶
مشرقِ وسطیٰ میں امریکی وصیہونی منصوبہ	ڈاکٹر محمد وثیق ندوی	۷
ہندوستانی مسلمانوں کی طبی خدمات	محمد جمیل اختر جلیلی ندوی	۹
تعارف وتبصرہ	محمد اصطفاء الحسن ندوی	۱۱
سوال وجواب	مفتی محمد ظفر عالم ندوی	۱۴
گوشہ بیاد مولانا ڈاکٹر نذیر احمد ندوی رحمہ اللہ		
نہ ستائش کی تمنا، نہ صلہ کی پرواہ	حضرت مولانا سید بلال عبد الحی حسنی ندوی	۱۵
جامع کمالات شخصیت	مولانا عمار عبد العلی حسنی ندوی	۱۸
اخلاق وکمال کا حسین امتزاج	مولانا محمد علاء الدین ندوی	۱۹
رخصت ہوا ایک خاموش فرشتہ	عبید اللہ محی الدین اسحاقی ندوی	۲۰
خلدِ بریں کا مکیں	مولانا محمد خالد غازیپوری ندوی	۲۱
بحرِ ادب کے عظیم شناور	ڈاکٹر محمد فرمان ندوی	۲۲
علم وفضل کا روشن چراغ	مولانا محمد ناصر ندوی	۲۵
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز	ڈاکٹر محمد اعظم ندوی	۲۶
کچھ سخنور تھے کہ سحر اپنا دکھا کر چل دیے	محمد ارمغان بدایونی ندوی	۲۷
مولانا ندویؒ اور تعلیم کی داخلی فضا	سید حذیفہ علی ندوی	۳۰
آہ مولانا نذیر ہم سب کے مولانا نذیر!	ادیب الرحمٰن غزالی ندوی	۳۱
زبان وادب کا درخشاں ستارہ	محمد ثاقب عالم ندوی	۳۲

سرپرست

حضرت مولانا سید بلال عبد الحی حسنی ندوی

(ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

مدیر مسئول

شمس الحق ندوی

نائب مدیر

محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی

معاون مدیر

محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی

محمد نفیس خان ندوی ❁ محمد جاوید اختر ندوی

مجلس مشاورت

مولانا عبد العزیز بھٹکلی ندوی ❁ مولانا محمد خالد غازیپوری ندوی

قارئین محترم! تعمیرِ حیات کا سالانہ زرِ تعاون ذیل میں دیے گئے اکاؤنٹ میں جمع کرائیں!

TAMEER E HAYAT
A/c. No. 10863759868 (Current A/c.)
IFSC Code : SBIN0000125 -- Swift Code : SBINNB157
State Bank of India, Main Branch, Lucknow

براہ کرم رقم جمع ہوجانے کے بعد دفتر کے فون نمبر یا ای میل پر خریداری نمبر کے ساتھ اطلاع ضرور دیدیں۔

ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتہ

TAMEER-E-HAYAT
Tagore Marg, Badshah Bagh, Lucknow - 226007, Ph.:0522-2740406
website : http://tameerehayat.com - email : tameer1963@gmail.com

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

سالانہ زرِ تعاون -/500	فی شمارہ -/25	ایشیائی، یورپی، افریقی وامریکی ممالک کے لئے۔ $100

ڈرافٹ منیجر تعمیر حیات کے نام سے بنائیں اور دفتر تعمیر حیات ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پتہ پر روانہ کریں۔ چیک سے بھیجی جانے والی رقم صرف All CBS Payable Multicity Cheques روانہ فرمائیں، بصورت دیگر =/30₹ جوڑ کر چیک دیں۔ براہ کرم اس کا خیال رکھیں۔

آپ کی خریداری نمبر کے نیچے اگر سرخ لکیر ہے تو سمجھیں کہ آپ کا زرِ تعاون ختم ہوچکا ہے، لہٰذا جلد ہی زرِ تعاون ارسال کریں۔ اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں، موبائل یا فون نمبر اور پتے کے ساتھ پن کوڈ بھی لکھیں۔ (منیجر تعمیر حیات)

پرنٹر پبلشر محمد طٰہٰ اطہر نے آزاد پرنٹنگ پریس، نظیر آباد، لکھنؤ سے طبع کرا کے دفتر تعمیر حیات مجلس صحافت ونشریات ٹیگور مارگ، بادشاہ باغ لکھنؤ سے شائع کیا۔

اداریہ

ندوہ کا مطلوب

محمد عمیر الصدیق ندوی

علامہ شبلی ۱۸/نومبر ۱۹۱۴ء کو اس دنیائے فانی سے رخصت ہوئے، اس وقت ان کے جانشین کی حیثیت سے تیس سالہ مولانا سید سلیمان ندوی ملک وقوم میں نیک نامی کے ساتھ متعارف ہو چکے تھے کہ اپریل ۱۹۱۵ء میں ندوے کے سالانہ اجلاس کا وقت آیا تو سید صاحب کے خطاب کو خصوصی اہمیت دی گئی۔ سید صاحب نے بھی اس خصوصیت کا اظہار یہ کہہ کر کیا کہ دار العلوم کی ضرورت اور اس کے فائدوں پر ایک مبسوط تقریر گذشتہ جلسوں کا لازمی جز و بنتی رہی ہے، جن بزرگوں نے ماضی کے جلسوں میں اس موضوع پر تقریریں کیں، وہ واقعات، دلائل اور جامعیت کے لحاظ سے یقیناً بے نظیر تھیں، لیکن یہ پہلا موقع ہے کہ خود دار العلوم کا آغوش پروردہ آج اپنی ضرورت کا اعلان کرتا ہے۔

دار العلوم کے باقاعدہ متعلم اور پھر فارغ التحصیل عالم اور خود سید صاحب کے الفاظ میں دار العلوم کے آغوش پروردہ فارغ التحصیل کی اس تقریر کی یاد اس لیے آئی کہ فارغین ندوہ کی صف سے نکل کر ندوہ کے اجلاس میں یہ پہلے باقاعدہ ندوی کی تقریر تھی۔

اس تقریر کی ابتدا ہی اس زمانے کے دیگر خطیبوں کے لب ولہجے سے الگ دوسرے ہی طرز کی تھی۔ سید صاحب کے ابتدائی الفاظ کچھ اس طرح کے تھے کہ اس وقت جس موضوع سخن پر مجھے کچھ کہنا ہے، آج بیس برس ہوئے کہ وہ مسلمانوں کے سامنے ایک دردانگیز داستان کی طرح بار بار دہرایا گیا ہے۔ نطق ولفظ کے تماشا بیں عجب نہیں کہ گھبرا اٹھیں لیکن دردآشنا دلوں نے ہر بار اس سے نیا لطف اٹھایا ہے:

ذوقِ نظر بہ لذت کاوش نمی رسد
وا غم ازیں کہ دل نتواں کرد دیدہ را

اس لیے اس وقت سراپا دل ہوں، تو امید ہے کہ یہ حکایت مکرر ناگوار نہ گزرے گی۔

یہ تمہید قصداً اُن کے لیے نقل کی گئی جن کو ندوہ کی تربیت کے منفرد انداز کو دیکھنے اور سمجھنے کی تمنا ہے۔ نطق ولفظ کے تماشا بیں ایک نوجوان فاضل ندوہ کے لہجے کے اس اعتماد کے مظہر الفاظ ہیں جن سے ندوہ کا نطق ہی نہیں، دردآشنا دل کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

سید صاحب کی اس تقریر میں وہی بات ہے جو اس زمانے کے سامعین کی طرح آج بھی سننے والوں کی سماعتوں کو غور وفکر کی نعمت عطا کرنے والی سچائی ہے۔

۱۹۱۵ء میں آج سے قریب سوا سو سال پہلے ایک نوجوان ندوی فاضل نے زمانہ کی نبض پر ہاتھ رکھ کر تشخیص کی تھی کہ زمانہ کے انقلاب اور حوادث نے جو مشکلیں پیدا کی ہیں، ان میں سب سے زیادہ اہم اور سب سے لائق توجہ، مذہب اور مذہبی علوم کی بقاو حفاظت کا مسئلہ ہے۔ مسلمان آج اعتراضات اور حملوں کی آماجگاہ ہیں، لوگ کہتے ہیں کہ ہاتھ بچاؤ کہ بغیر اس کے کسب وتحصیل محال ہے، پاؤں بچاؤ کہ بے پاؤں میدان میں ٹکا ہونا ممکن ہے، لیکن میں کہتا ہوں کہ سینہ بچاؤ کہ اس میں دل ہے جو زندگی کا گھر ہے۔

مادیات اور روحانیت کی دنیاؤں کی اتنی آسان تفریق وتشریح شاید پہلی بار سنی گئی ہو اور وہ بھی ندوہ کی پہلی اور قطعی نئی آواز کے ذریعہ۔ اسی نئی آواز نے دیرینہ قوت کے ساتھ کہا کہ قومیتِ اسلام کا دل کیا ہے؟ وہ مذہب ہے! تمام دنیا کی قوموں میں مذہب قومیت سے ہے لیکن مسلمانوں میں قومیت مذہب سے ہے۔ یہ پر اعتماد لہجہ نئے اسلامی ہند کو کس کی عطا تھی؟ اس کے اعتراف کی ہمت نہ ہو تو بھی اس کا اقرار کرنے میں لکنت کی ضرورت نہیں۔

نوجوان ندوی سید نے پھر کہا کہ اگر مذہبی قومیت کا شیرازہ بکھرا تو قومیت اسلامیہ کے اوراق خزاں دیدہ ایک ایک کر کے بکھر جائیں گے۔

آگے اور جو کہا اس کے سننے کی تاب کاش اب بھی پیدا ہو جائے، سید صاحب نے کہا کہ جو لوگ مذہب اور مذہبی علوم کی بقا و حفاظت کے قائل نہیں ہیں، روئے سخن تو ان کی جانب ہے، لیکن جو ہماری باتوں کے قائل ہیں ان سے سوال ہے کہ اگر مذہبی قومیت ضروری ہے تو اب تک مسلمانوں کی طرف سے اس کے لیے کیا کیا تدبیر عمل میں آئی۔ کیا ہماری انگریزی درسگاہوں کے وسیع ایوان، کیا ہمارے مذہبی تعلیم گاہوں کے تنگ و تاریک حجرے کوئی جواب دے سکتے ہیں؟

اس سوال کا جواب اسی تقریر کے اگلے جملے میں آ گیا کہ ہندوستان جب انقلاب کی کشاکش میں تھا، تو چند روشن ضمیروں نے ایسی شیریں اور دل پسند آواز دی کہ گوشے گوشے سے لبیک کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ ندوہ کی مجلس مرتب ہوگئی، علمائے ہند جن کا مشغلہ صرف نزاع و کشاکش باہمی تھا، خواب سے چونکے۔ محبت و ہمدردی کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف بڑھے اور بالآخر قوم کے تمام امراض کا علاج دار العلوم قرار پایا۔

دار العلوم کو ایسے رہبر مطلوب ہیں جو زندگی کے تمام شعبوں میں قوم کی رہبری کر سکیں، ضرورت ہے کہ ہر موقع کو پہچان سکیں اور اصلاح و ہدایت کی ہر صنف میں چراغ راہ بن سکیں۔

سید صاحب کی تقریر تو پوری کی پوری نقل کرنے کی ضرورت ہے۔ یہاں زیادہ زور پہلے نوجوان ندوی کی پہلی تقریر پر اس لیے ہے کہ ایک اور ندوی مولانا نذیر احمد جو ہمارے لیے نوجوان ہی تھے؛ لیکن وقت موعود مقرر تھا، رخصت ہو گئے۔ مگر اپنے عمل اور کردار سے ندوہ کا مطلوب بن کر گئے۔ ان کے لیے اس شمارہ کا ایک گوشہ اس لیے خاص کیا گیا ہے کہ ندوہ کے سوا سو سالہ زندگی کے تسلسل پر نظر رہے۔ ندوہ جن کا طالب تھا اور جو اس کے مطلوب ہوئے، ان کا تذکرہ اسی تسلسل کی توسیع کے لیے ہے۔

اسلام دین اعتدال ہے!

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

اسلام میں مذہبی عمل کا دائرہ صرف عبادت تک محدود نہیں ہے، وہ عقیدۂ توحید، عائلی تعلقات، سماجی معاملات اور مالی احکام تک پھیلا ہوا ہے، اور عبادت ہی کی طرح وہ قابل عمل ہیں، ان ہی میں شوہر و بیوی کے تعلقات، نکاح و طلاق اور وراثت کی تقسیم کے معاملات، ان کے علاوہ قرآن و حدیث سے حاصل کردہ دیگر ہدایات پر عمل کرنا شامل ہے، ان میں انسان کے نفع و ضرر دونوں کا بہت حکیمانہ انداز پایا جاتا ہے، اور ان تفصیلات و مصلحتوں کی صحیح تشریح، قرآن و حدیث کو تفصیل و توجہ سے پڑھے بغیر کوئی انسان نہیں کر سکتا، اس کے سلسلہ میں قرآن و حدیث کا بہتر علم رکھنے والے ہی ان کی مصلحت و انسانی ضرورت سے ان کی مطابقت بتا سکتے ہیں، خواہ نکاح کا مسئلہ ہو یا طلاق کا۔

اور طلاق بظاہر سختی کا عمل سمجھا گیا ہے؛ لیکن وہ سخت خطرہ سے بچانے کے لیے بطور ضرورت رکھی گئی ہے، اور جہاں تک عورت کو مرد سے کمتر سمجھنے کا الزام ہے، وہ حقیقت حال کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے، ورنہ نکاح و طلاق و میراث میں عورتوں کے لیے فائدہ کی صورتیں مردوں سے زیادہ رکھی گئی ہیں، مثلاً نکاح کے سارے اخراجات مرد کے ذمہ رکھے گئے ہیں اور عورت پر کوئی بوجھ نہیں ڈالا گیا ہے، بلکہ اس کو مہر کی رقم بھی تعلق کی علامت کے طور پر ملتی ہے، اور نکاح کے بعد اس کے تمام مصارفِ زندگی شوہر کے ذمہ رکھے گئے ہیں، وہ جب تک اپنے ماں باپ کے ساتھ ہوتی ہے اس کا سارا خرچ اس کے باپ کے ذمہ ہوتا ہے، شادی کے بعد اس کے مصارف شوہر کے ذمہ ہو جاتے ہیں، اور اس کا تعلق اپنے ماں باپ اور خاندان سے باقی بھی رہتا ہے، وہ شوہر سے علاحدگی یا موت پر اپنے خاندان واپس ہو جاتی ہے اور نئے شوہر سے شادی کر سکتی ہے، شوہر کے انتقال پر شوہر کی جائیداد میں اس کا بھی حصہ رکھا گیا ہے، اس طرح کی سہولتیں مرد کے لیے نہیں ملتی ہیں؛ بلکہ عورت کی ذمہ داری بھی اس کے سر آ جاتی ہے، اور عزت و حرمت کے لحاظ سے اس کو مرد کے ہم مرتبہ سمجھا جاتا ہے، ان باتوں کی واقفیت نہ ہونے کی بناء پر اسلام میں عورت پر ظلم کا الزام، عورت کے سلسلہ میں کم تری کا الزام، بالکل ناواقفیت یا مخالفت کی وجہ سے دیا جاتا ہے۔

تعلیم الحدیث

مردِ مومن کی نشانی

عبدالرشید راجستھانی ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

عَنْ أَبِي قَتَادَةَ الحَارِثِ بنِ رِبْعِيٍّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: كُنَّا مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ فِي مَجْلِسٍ، فَمَرَّتْ جِنَازَةٌ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: »مُسْتَرِيحٌ وَمُسْتَرَاحٌ مِنْهُ«، قَالُوا: يَا رَسُولَ اللهِ، مَا الْمُسْتَرِيحُ وَالْمُسْتَرَاحُ مِنْهُ؟ قَالَ: »الْعَبْدُ الْمُؤْمِنُ يَسْتَرِيحُ مِنْ نَصَبِ الدُّنْيَا وَأَذَاهَا إِلَى رَحْمَةِ اللهِ، وَالْعَبْدُ الْفَاجِرُ يَسْتَرِيحُ مِنْهُ الْعِبَادُ وَالْبِلَادُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ. (رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ: 6512)

ترجمہ: ابوقتادہ حارث بن ربعی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک مجلس میں بیٹھے تھے کہ ایک جنازہ گزرا۔ رسولِ اللہ ﷺ نے فرمایا: ”مستریح ومستراح منہ“ یعنی ”مرنے والے دوطرح کے ہوتے ہیں: ایک وہ جو خود راحت پاتا ہے، اور دوسرا وہ جس سے مخلوق راحت پاتی ہے۔“ صحابہؓ نے عرض کیا: یارسولَ اللہ! یہ مستریح اور مستراح منہ کون ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ”مؤمن بندہ دنیا کی مشقتوں اور اذیتوں سے آزاد ہو کر اللہ کی رحمت میں داخل ہوتا ہے، اور فاجر شخص سے اللہ کے بندے، زمین، درخت اور جانور سب راحت پاتے ہیں۔“

تشریح: یہ حدیث نبوی ﷺ انسانی زندگی اور موت کی حقیقت کو نہایت جامع اور دل کو چھو لینے والے انداز میں واضح کرتی ہے، نیز مومن وفاجر کے انجام کے فرق کو ایک مختصر مگر نہایت بلیغ تمثیل میں پیش کرتی ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ مرنے والا یا تو خود راحت پانے والا ہوتا ہے یا اس کی موت دوسروں کے لیے راحت کا باعث ہوتی ہے۔

مومن جب دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو گویا ایک طویل و پرمشقت سفر ختم کر کے اپنی اصل جائے قرار اور حقیقی آرام گاہ پر پہنچتا ہے۔ دنیا اس کے لیے محنت ومشقت، آزمائش اور اذیت کی جگہ تھی، اور موت اس کے لیے رحمت و راحت کا دروازہ۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ”الدنیا سجن المؤمن وجنۃ الکافر“ یعنی دنیا مومن کے لیے قید خانہ اور کافر کے لیے جنت ہے۔

مومن کی روح جب قبض کی جاتی ہے تو فرشتے اسے سلام اور بشارت کے ساتھ اللہ کی رحمت میں داخل کرتے ہیں جیسا کہ قرآن میں ہے: ﴿الَّذِينَ تَتَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ طَيِّبِينَ يَقُولُونَ سَلَامٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ﴾ [النحل:۳۲]

ترجمہ: جن لوگوں کی روحیں فرشتے پاکیزگی کی حالت میں قبض کرتے ہیں، ان سے کہتے ہیں: تم پر سلامتی ہو، داخل ہو جاؤ جنت میں، اس کے بدلے جو تم کرتے رہے۔

اس کی راحت اس بات کا صلہ ہے کہ اس نے دنیا میں صبر، استقامت اور رضا کی راہ اپنائی۔ قرآن کہتا ہے: ﴿إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ﴾ [فصلت:۳۰]

ترجمہ: بے شک جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے، پھر اس پر ثابت قدم رہے، ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو، اور خوش ہو جاؤ اس جنت کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ موت کے وقت مومن کے چہرے پر سکون اور تبسم نمایاں ہوتا ہے، جیسے شاعر نے کہا ۔

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست

یہ تبسم دراصل اس اطمینان کا مظہر ہے جو ایمان اور یقین سے بھرپور زندگی کا ثمر ہوتا ہے۔ دوسری طرف فاجر اور ظالم انسان کی موت زمین، بندوں، درختوں اور جانوروں کے لیے راحت کا باعث بنتی ہے۔ وہ اپنی زندگی میں ظلم، شرارت اور فتنہ پھیلانے والا ہوتا ہے، جس سے مخلوق تکلیف میں رہتی ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ”یستریح منہ العباد والبلاد والشجر والدواب“ یعنی اس سے بندے، زمین، درخت اور جانور سب راحت پاتے ہیں۔

فائدہ: یہ حدیث ہر انسان کے لیے آئینہ ہے۔ موت سے کوئی مفر نہیں، ہر کسی کو ایک دن مرنا ہے، سوال یہ ہے کہ ہم کس انجام کے لیے تیاری کر رہے ہیں؟ زندگی کا مقصد یہی ہے کہ انسان ایسا کردار اپنائے جس سے دنیا میں خیر پھیلے۔ جب وہ دنیا سے رخصت ہو تو دنیا اس کے جانے سے غم زدہ ہو لیکن وہ اپنے رب کی بشارت سے فرحاں و نازاں ہو۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان بندوں میں شامل فرمائے جن کے مرنے پر فرشتے سلام کہیں، رحمت کے دروازے کھل جائیں اور ان کی روح کو قرار ابدی نصیب ہو آمین۔

عالم اسلام

مشرقِ وسطیٰ میں امریکی وصہیونی منصوبہ

ڈاکٹر محمد وثیق ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

موجودہ عالمی منظرنامہ اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ دنیا کے نظام کو ازسرِ نو ترتیب دینے کے لیے ایک خطرناک منصوبہ زیرِ عمل ہے، خصوصاً مشرقِ وسطیٰ کے خطّے میں جہاں عالمی طاقتیں اپنے مفادات کے لیے براہِ راست یا بالواسطہ صف آرا ہیں۔

درحقیقت یہ ایک امریکی-صہیونی منصوبہ ہے جس کا مقصد صہیونی وجود کی حفاظت، اس کی توسیع اور خطے میں اس کی مطلق بالادستی کو یقینی بنانا ہے، تاکہ کسی پڑوسی ملک سے اس کے لیے خطرہ باقی نہ رہے، گزشتہ برسوں میں جن عرب اور اسلامی ملکوں کو تباہی وانتشار کا نشانہ بنایا گیا، وہ اسی منظم منصوبے کا حصہ تھے جس کا مقصد اسرائیل کو تحفظ فراہم کرنا اور اس قوت کو کچل دینا تھا جو مستقبل میں اس کے لیے خطرہ بن سکتی تھی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر حمود النوفلی نے اپنے ایک حالیہ مضمون میں لکھا ہے:

”اس مبینہ خطرے سے بچنے کے لیے جارحانہ اقدامات کیے گئے، عراق اور اس کی فوج کو تباہ کیا گیا— وہ فوج جو خطے کی مضبوط ترین فوجوں میں شمار ہوتی تھی۔ پھر لیبیا کی باری آئی جو صہیونیت کی مخالف اور اسلحے کے وسیع ذخائر کی مالک تھی۔ اس کے بعد سوڈان کو توڑ دیا گیا، جو اپنی زرخیز زمینوں، قیمتی وسائل اور اسلامی فوج کے باعث عالمِ عرب کی اسٹریٹجک گہرائی رکھتا تھا۔ سوڈان کو دو حصوں میں بانٹ دیا گیا، پھر وہاں کے نظامِ حکومت کو گرانے کی تحریک چلائی گئی، اس کے بعد نئے نظام پر اسرائیل سے تعلقات قائم کرنے کے لیے دباؤ ڈالا گیا، مگر وہ بھی کافی نہ ہوا، فوج کے اندر ایسے افراد کی موجودگی جو صہیونیت کے مخالف تھے، امریکہ و اسرائیل کے لیے خطرہ کا باعث بنی۔ چنانچہ ان پر ایران سے تعاون کا الزام لگا کر داخلی خانہ جنگی پیدا کی گئی تاکہ سوڈان کی طاقت کو ختم اور اس کے عرب واسلامی کردار کو معطل کر دیا جائے۔ یمن کی عسکری طاقت کو اس لیے توڑا گیا کہ وہ خطے کے تزویراتی نقشے میں اسرائیل کے لیے خطرہ بن سکتی تھی، یمن کی جغرافیائی حیثیت انتہائی اہم ہے، کیونکہ وہ دنیا کے حساس ترین سمندری راستوں پر واقع ہے، یہی وجہ ہے کہ اسے علاقائی طاقتوں کے اشتراک سے ایک طویل خانہ جنگی میں مبتلا کر دیا گیا، جو تیرہ سال سے جاری ہے۔ شام میں جو کچھ ہوا وہ محض داخلی سیاسی کشمکش نہ تھی، بلکہ ایک بڑے عالمی منصوبے کا حصہ ہے۔ عرب دنیا کی دفاعی قوتیں، جو کبھی اپنی سرزمینوں کی محافظ تھیں، اب غیر ملکی پالیسیوں کے تابع بنا دی گئیں اور یوں اسرائیل وہ واحد ریاست بن گئی جو ان تمام بحرانوں سے فائدہ اٹھا رہی ہے، جبکہ امتِ مسلمہ کے عوام نے اس قیمت کو تباہی، دربدری اور غربت کی صورت میں ادا کیا“۔

آج مصر، ترکی، ایران اور پاکستان کی افواج کے خلاف بھی سازشوں کے آثار دکھائی دیتے ہیں، النوفلی لکھتے ہیں کہ ”جب ان سے پوچھا گیا: خطے کی بعض حکومتیں اس امریکی-صہیونی منصوبے میں شریک کیوں ہیں، جب کہ وہ اس کے خطرات کو بخوبی جانتی ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا: انہیں یقین دلایا گیا کہ وہ ان فوجوں کے خاتمے کے بعد ’خطے کے پولیس‘ ہوں گے۔ وہ اس فریب میں آ گئے کہ واشنگٹن انہیں علاقائی بالادستی عطا کرے گا، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اصل پولیس، جسے دہائیوں سے تیار کیا جا رہا ہے، وہ صہیونی ریاست ہے— امریکہ کا حقیقی بازو اور وہ قوت ہے جسے اسی مقصد کے لیے تیار کیا گیا ہے“۔

آج دنیا ایک تیسری عالمی جنگ کے دہانے پر کھڑی ہے، امریکہ نے روس کے مقابلے کے لیے ایٹمی آبدوزیں روانہ کر دی ہیں، اور مشرقِ وسطیٰ سمیت دیگر اسٹریٹجک علاقوں میں اپنے طیاروں اور جنگی بیڑوں کی تعیناتی تیز کر دی ہے، جس سے ٹرمپ کے ”جنگ کے خاتمے“ کے دعوے مشکوک بن جاتے ہیں۔ دوسری جانب روس بحرالکاہل، قطب شمالی، بحیرہ بالٹک اور قزوین میں وسیع بحری مشقیں کر رہا ہے، جبکہ مغربی ممالک روس کے خلاف فوجی محاذ کو مزید مستحکم کر رہے ہیں اور یوکرین کو روس کے ساتھ براہِ راست تصادم کے ہتھیار کے طور پر استعمال کر

رہے ہیں، روس کے پیچھے ابھرتی ہوئی عالمی طاقت چین کی تائید بھی شامل ہے۔

ان حالات میں اسرائیل کی سرکشی، امریکہ کی بے حسی اور خطہ کی بعض حکومتوں کی کمزوری سخت تشویش ناک ہے۔ ٹرمپ کا نام نہاد ''امن منصوبہ'' دراصل اسرائیلی بالادستی کو استحکام ودوام دینے کی ایک نئی کوشش ہے۔ امریکی اخبار نیویارک ٹائمز (The New York Times) کے تجزیہ نگار ''تھامس فریڈمین'' (Thomas L. Friedman) نے اسے ''ایک خطرناک منصوبہ'' قرار دیتے ہوئے کہا کہ ''یہ مشرقِ وسطیٰ کو ازسرِ نو ترتیب دینے کی کوشش ہے — جس کے ذریعے نہ صرف تنازعے کا نیا فریم ورک بنایا جائے گا بلکہ سعودی عرب، لبنان، شام اور عراق سمیت پورے خطے کو اسرائیل کے ساتھ تعلقات بحال کرنے پر راضی کیا جائے گا''۔

برطانوی اخبار انڈیپینڈنٹ (The Independent) نے اس امن منصوبہ کو ''نوآبادیاتی فریب'' کہا اور لکھا کہ: ''امریکہ اور اسرائیل نے ایک خفیہ منصوبہ تیار کیا ہے جس کے تحت اسرائیل کو غزہ پر دوبارہ قابض ہونے یا اسے اپنی مرضی کے مطابق چلانے کی اجازت دی جائے گی۔ اس منصوبے کا منتظم ٹونی بلیئر ہے، جو مشرقِ وسطیٰ میں سخت ناپسندیدہ شخصیت ہے، جبکہ اس منصوبے کا بادشاہ ڈونلڈ ٹرمپ ہوگا''۔

مشرقِ وسطیٰ کے حالات اور غزہ کا انسانی المیہ اسی امریکی۔صہیونی منصوبے کا حصہ ہے۔

دنیا بھر میں بڑے پیمانے پر احتجاج، حتیٰ کہ مغربی ممالک میں بھی عوامی مظاہروں کے باوجود، اسرائیل اپنے ظلم وجارحیت سے باز نہیں آتا، وہ امدادی قافلوں کو روکتا ہے اور انسانی ہمدردی کی ہر کوشش کو ناکام بناتا ہے، جیسا کہ ''فریڈم فلوٹیلا'' کے واقعے میں ہوا، جب اسرائیل نے درجنوں جہازوں پر قبضہ کیا اور امدادی کارکنوں کو گرفتار کر لیا، امریکہ، جو خود کو حقوقِ انسانیت کا علمبردار کہتا ہے، اس پر خاموش تماشائی بنا رہا۔

انجمن اقوامِ متحدہ ۲۴/اکتوبر ۱۹۴۵ء کو دوسری جنگِ عظیم کے بعد قیامِ امن، انسانی حقوق کے تحفظ، عالمی قانون کے نفاذ اور انسانی امداد کے لیے قائم کی گئی تھی — آج وہ معطل ومفلوج ہو چکی ہے، محض قراردادوں، مذمتوں اور تقریروں کا پلیٹ فارم بن کر رہ گئی ہے، بڑی طاقتیں اپنی مرضی سے اسے چلاتی ہیں اور عملاً یہ ادارہ امریکہ کے تسلط میں ہے جو اسے جب چاہے اور جیسے چاہے استعمال کرتا ہے۔

لہٰذا اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ اقوامِ متحدہ کو اس کے مفلوج کردار سے نکالا جائے اور اسے دوبارہ سرگرم بنایا جائے تاکہ بڑی طاقتیں اپنی من مانی نہ کر سکیں اور کمزور قومیں یتیموں کی طرح پامال نہ ہوں — جیسا کہ آج غزہ کے ساتھ ہو رہا ہے۔ مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ نے اپنی کتاب ''صور وأوضاع'' میں لکھا ہے کہ اقوامِ متحدہ کا یہ مفلوج کردار اور بڑی طاقتوں کے زیرِ اثر ہونا ہی دنیا بھر میں بدامنی اور عدم استحکام کی اصل وجہ ہے۔ اگر یہ صورتِ حال برقرار رہی تو موجودہ علاقائی تنازعات بالآخر ایک تیسری عالمی جنگ میں تبدیل ہو جائیں گے، جو اپنی تباہی میں پچھلی دونوں جنگوں سے کہیں زیادہ ہولناک ہوگی، کیونکہ اب اسلحہ سازی کی صنعت کہیں زیادہ مہلک ہو چکی ہے''۔

ان حالات میں ضروری ہے کہ ایک بین الاقوامی مشترکہ فوج تشکیل دی جائے تاکہ غزہ کو تباہی سے بچایا جا سکے۔ کولمبیا کے صدر گوستاوو پیٹرو نے اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب میں یہی مطالبہ کیا تھا کہ دنیا کے ممالک اپنی افواج کو متحد کریں اور فلسطین کی آزادی کے لیے مشترکہ اقدام کریں۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ عالمِ اسلام اسلامی اخوت کی بنیاد پر متحد ہو، حکمراں، سیاستداں، مفکر، علما اور قائدینِ امت اپنی ذمہ داری کا احساس کریں۔ اگر یہ احساس بیدار ہو جائے تو امتِ مسلمہ نہ صرف اپنی مشکلات حل کر سکتی ہے؛ بلکہ انسانیت کی رہنمائی کا فریضہ بھی انجام دے سکتی ہے۔

اسلامی دنیا کے کئی لیڈران نے ایک ''مشترکہ اسلامی فوج'' کے قیام کی ضرورت پر زور دیا ہے، تاکہ اسرائیلی جارحیت کو روکا جا سکے اور اسلامی وعرب ممالک کی خودمختاری محفوظ رکھی جا سکے۔ لیکن یہ محض نعروں اور جذباتی تقریروں سے ممکن نہیں۔ اس کے لیے عقل، تدبر، حکمتِ عملی اور عزت وشرف کے شعور کی ضرورت ہے، تاکہ امت اپنے اصولوں پر ثابت قدم رہے اور ذلت آمیز دباؤ کو قبول نہ کرے۔ عربی شاعر عمرو بن براقۃ ہمدانی کہتا ہے:

متى تَجمَعِ القلبَ الذكيَّ وصارِمًا
وأنفًا حميًّا تَجتَنِبكَ المظالِمُ

(جب عقلِ سلیم، حکمت ودانائی، عزمِ صادق اور غیرتِ ایمانی یکجا ہو جائیں، تب ہی تم مظالم سے بچ سکتے ہو)۔

تاریخ ہند

ہندوستانی مسلمانوں کی طبی خدمات

محمد جمیل اختر جلیلی ندوی (استاذ جامعہ ضیاء العلوم کنڈلور)

طب ایک قدیم اور ارتقاء پذیر علم ہے، جو انسانی صحت کی دیکھ بھال، بیماریوں کی تشخیص، علاج اور روک تھام سے متعلق ہے، مختلف تہذیبوں نے اس میدان میں اہم خدمات انجام دی ہیں، جن کی بنیاد پر جدید میڈیکل سائنس نے ترقی کی، طب کی ابتدا کے بارے میں مختلف آراء ہیں؛ بعض اسے الہامی سمجھتے ہیں جبکہ مصر، بابل، فارس، چین، یونان اور ہندوستان نے اس کی بنیاد رکھنے کا دعویٰ کیا ہے، مصر کی ایک قدیم روایت کے مطابق، ایک عورت کی تجرباتی شفا کو طب کا آغاز مانا گیا ہے، جب کہ بابل کو دنیا کا اولین طبی مرکز قرار دیا جاتا ہے، جہاں طب کی تحریری شکل ۴۰۰۰ قبل مسیح کے قریب ملتی ہے، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فنِ طب کسی ایک قوم کی ایجاد نہیں؛ بل کہ مختلف اقوام کی مشترکہ علمی کاوشوں کا نتیجہ ہے اور ہندوستان نے اس علم کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔

علاج ومعالجہ کے قدیم نظاموں جیسے: طبِ یونانی، آیوروید، طبِ چینی اور طبِ نبوی ﷺ نے دنیا بھر میں صحت کی بنیاد رکھی، مسلمانوں نے بالخصوص طبِ یونانی کو فروغ دیا، جسے عباسی دور میں ادارہ جاتی حیثیت ملی، جب مسلمان حکمران ہندوستان آئے تو طبِ یونانی بھی ساتھ آئی، محمود غزنوی، محمد غوری اور بعد کے سلاطینِ دہلی اور مغلوں کے زیرِ سایہ طب کو عروج حاصل ہوا، ہندوستانی مسلمانوں نے طبی تعلیم، تحقیق اور تصنیف میں نمایاں کردار ادا کیا، جس سے یہ علم برصغیر میں جڑ پکڑ گیا۔

ہندوستان میں یونانی طب کی آمد محمود غزنوی کے دور میں ہوئی، سلطان محمود علم دوست حکمران تھے، جن کے دربار میں اہلِ فن، خصوصاً اطباء کو اعلیٰ مقام حاصل تھا، اس دور میں ہندوستان میں کئی طبی و علمی جامعات قائم تھیں، جیسے اجنتا اور نالندہ، جن سے مسلمان حکمرانوں اور علماء نے بھرپور استفادہ کیا، محمود غزنوی کے دور میں ہندوستانی طب کو عربی میں منتقل کیا گیا اور یونانی طب کو فروغ حاصل ہوا، اس دور کے نمایاں طبی ماہر ابوریحان البیرونی تھے، جنہوں نے ہندی طب پر گہرا مطالعہ کیا، آیوُرویدک کتب کا عربی میں تجزیہ پیش کیا اور طب پر اپنی مشہور کتابیں "تحقیق ما للهند" اور "الصيدنة في الطب" تصنیف کیں، ان کی کوششوں سے اسلامی اور ہندی طب کے درمیان علمی تبادلہ ممکن ہوا، جو طبی تاریخ کا ایک اہم سنگ میل ہے، یہ سلسلہ محمود غزنوی کے جانشینوں کے دور میں بھی جاری رہا۔

عہدِ غوری اور سلطنتِ غلامان میں تعلیم وطب کو اہم مقام حاصل تھا، شہاب الدین غوری نے مدارس قائم کیے، جہاں طب کی تعلیم بھی دی جاتی تھی، اس دور میں کئی اطباء بیرونِ ملک سے آ کر ہندوستان میں مقیم ہوئے اور طب یونانی کو فروغ ملا، نظامی عروضی جیسے اہلِ علم نہ صرف ادیب؛ بل کہ ماہر طبیب بھی تھے، غلامان کے دور میں حکمران علم دوست تھے، جن کے دربار میں معروف اطباء خدمات انجام دیتے تھے، ان کے دور میں بھی طب یونانی کو خاص عروج حاصل ہوا اور اہم طبی کتب کا ترجمہ اور تصنیف عمل میں آیا، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ طب کو علمی و عملی سطح پر خوب فروغ ملا۔

عہدِ خلجی، تغلق اور لودھی سلطنتوں میں طب و حکمت کو زبردست فروغ حاصل ہوا، سلطان علاء الدین خلجی کے دور میں دہلی طبی علوم کا مرکز بن گیا، جہاں اطباء کو وظائف دیے گئے، اور "صحتِ علائی" جیسی کتب نے علمی سرگرمی کو دوام بخشا، تغلق بادشاہوں خصوصاً فیروز شاہ نے طبی ادارے قائم کیے، پچاس سے زائد شفاخانے بنائے اور طب میں اپنی مہارت کا عملی مظاہرہ کیا، "طبِ فیروز شاہی" اور "راحت الانسان" جیسی کتب اسی عہد کی یادگاریں ہیں، لودھی دور میں سلطان سکندر لودھی نے یونانی وآیورویدک طب کو یکجا کرنے کی کوشش کی، "معدن الشفا سکندر شاہی" اور "طبِ سکندری" جیسی کتب تصنیف ہوئیں، ان ادوار میں طب نہ صرف علم بلکہ عملی خدمت اور روحانیت کا امتزاج بن کر نمایاں ہوئی۔

مغلیہ سلطنت (۱۵۲۶ء تا ۱۸۵۷ء) کا دور برصغیر کی طبی تاریخ کا ایک روشن اور زریں باب ہے، اس دور میں طب یونانی کو بھرپور سرکاری سرپرستی حاصل رہی، متعدد شہروں میں شفاخانے قائم کیے گئے اور اطباء وحکما کو اعزازات سے نوازا گیا، مغل بادشاہوں کو نہ صرف طب سے گہری دلچسپی تھی؛ بلکہ انہوں نے طبی تعلیم وتحقیق کو فروغ

دینے کے لیے عملی اقدامات بھی کیے، بابر نے اپنی سوانح بابرنامہ میں علاج معالجہ اور ادویات کا تذکرہ کیا ہے، جو اس کی طبی معلومات کا ثبوت ہے، ہمایوں نے فاضل حکیم یوسف ہروی کو اپنا سیکریٹری مقرر کیا، جو علم طب سے اس کی دلچسپی ظاہر کرتا ہے، اکبر کے دور میں کئی بڑے شفاخانے قائم ہوئے اور دربار میں متعدد نامور اطباء شامل تھے، جہانگیر کو طب یونانی سے خاص شغف تھا، تزکِ جہانگیری میں ادویات وعلاج کا ذکر موجود ہے، شاہجہان نے دہلی میں جامع مسجد کے قریب ایک عظیم شفاخانہ تعمیر کروایا، اورنگ زیب طب نبوی سے خاص رغبت رکھتے تھے اور اس دور میں طبی کتب کا ترجمہ وتصنیف عروج پر تھی، نیز متعدد شفاخانے بھی قائم کیے گئے، زوال کے دور میں بھی طب یونانی کو فروغ حاصل رہا، ہندی النسل اطباء نے کئی اہم طبی کتابیں تالیف کیں، مغلیہ دور کے اہم طبی مراکز میں آگرہ، دہلی، فتح پور سیکری اور اٹاوہ کے شفاخانے شامل ہیں، مشہور اطباء میں حکیم یوسفی ہروی نمایاں ہیں، جنہوں نے متعدد قیمتی رسائل و کتب تصنیف کیے، یہ تمام تفصیلات ظاہر کرتی ہیں کہ مغلیہ عہد طب وحکمت کے فروغ کا دور تھا، جس میں علمی و عملی سطح پر طب کو بے مثال ترقی حاصل ہوئی۔

عہد مغلیہ کے دوران، طبی خدمات میں دو اہم خاندانوں کا کردار نمایاں رہا: شریفی خاندان: اس خاندان نے طب یونانی کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا اور اس کی خدمات میں متعدد نامور اطباء شامل ہیں جیسے حکیم شریف خاں اور حکیم صادق علی خاں، حکیم شریف خاں نے طب یونانی کی ترقی کے لیے مختلف کتابیں لکھیں، جن میں ''علاج الامراض'' اور ''تحفۂ عالم شاہی'' شامل ہیں، ان کے بعد ان کے بیٹے حکیم صادق علی خاں اور پوتے حکیم اجمل خاں نے خاندان کی طبی روایت کو آگے بڑھایا۔ حکیم اجمل خاں نے طب میں مجتہد کا درجہ حاصل کیا اور مختلف طبی رسائل لکھے۔ عزیزی خاندان: یہ خاندان مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد بھی طب یونانی کی بقاوترقی کے لیے سرگرم رہا، حکیم محمد یعقوب نے طب میں اپنی مہارت کا لوہا منوایا، اور ان کے بعد حکیم عبدالعزیز نے ''تکمیل الطب'' نامی مدرسہ قائم کیا، اس خاندان کے دیگر اہم اطباء میں حکیم عبداللطیف شامل ہیں، جنہوں نے ابن سینا کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا اور طب پر کئی کتابیں لکھیں، یہ دونوں خاندان طب یونانی کے فروغ اور اس کی بقا میں اہم کردار ادا کرتے رہے۔

دکن کی مسلم حکومتوں نے بھی طب یونانی کی بقا اور فروغ میں اہم کردار ادا کیا، بہمنی سلطنت کے دوران، حکیم نصیرالدین شیرازی اور حکیم علاؤالدین تبریزی جیسے ماہر معالجین سامنے آئے اور فیروز شاہ بہمنی نے طب کی سرپرستی کی، قطب شاہی سلطنت میں حاکموں نے طب یونانی کی حمایت کی، حیدرآباد میں اعلیٰ معیار کے شفاخانے کھولے گئے اور حکیم میر مومن جیسے ماہر طبیب نے اہم کتابیں لکھیں، نظام شاہی میں، حکیم رستم جرجانی اور حکیم گیلانی جیسے اطباء نے علمی خدمات انجام دیں، عادل شاہی سلطنت میں، حکیم ابوالقاسم فرشتہ نے ''دستور الاطباء'' جیسی اہم کتاب لکھی، آصف جاہی سلطنت میں، حکیم رضا علی خان اور حکیم شفائی خان جیسے مشہور اطباء نے طبی خدمات فراہم کیں اور پچاس سے زائد شفاخانے قائم کیے گئے، اس دور میں طب یونانی کو بڑی پذیرائی ملی اور بہت سی طبی کتابیں اور رسائل تحریر ہوئے۔

برطانوی عہد میں مسلمانوں نے طب یونانی کی بقا اور ترقی کے لیے اہم کردار ادا کیا، اس دور میں جب مغربی علوم نے طب یونانی کو متاثر کیا، مختلف مسلم اطباء نے اس علم کو محفوظ رکھا اور اس کی تدریس اور تحقیق میں اہم خدمات انجام دیں، حکیم اعظم خان، سید غلام حسین کنتوری، حکیم محمد الیاس خان، اور حکیم عبدالحمید دہلوی جیسے عظیم طبیبوں نے اس علم کو نئی نسل تک پہنچایا، حکیم عبدالرزاق نے طب یونانی کی عالمی سطح پر پہچان کے لیے اہم کام کیا اور سینٹرل کونسل فار ریسرچ اِن یونانی میڈیسن (CCRUM) کا قیام عمل میں لایا، اس دور کے مسلم طبی خاندانوں جیسے خاندان شریفی، عزیزی، عثمانی، اور بقائی نے بھی طب کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا اور اپنے علمی ورثے کو نسل در نسل منتقل کیا۔

بھارت میں مغربی طب کا آغاز برطانوی راج کے دوران ہوا، جب ۱۸۳۵ میں کلکتہ میڈیکل کالج قائم کیا گیا، برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے مقامی افراد کو مغربی طب کی تعلیم دینے کے لیے یہ ادارے قائم کیے، جن میں اناٹومی، فزیالوجی، سرجری اور میڈیسن جیسے موضوعات شامل تھے، ابتدا میں مسلمانوں نے اسے اجنبی اور دینی لحاظ سے مشکوک سمجھا؛ لیکن سر سید احمد خان اور دیگر مصلحین نے انہیں مغربی علوم کی طرف راغب کیا، آج بھارت میں مغربی طب کے سیکڑوں کالجز اور مسلمانوں کے زیر انتظام اسپتال اور تنظیمیں فعال ہیں، جو مختلف طبی خدمات فراہم کر رہی ہیں۔

رسید کتب

تعارف و تبصرہ

محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

تذکرہ علمائے حال

از:-مولانا محمد ادریس نگرامیؒ

ملکِ اودھ میں ضلع لکھنؤ کی بستی ’نگرام‘ صدیوں سے علمی، تعلیمی، تصنیفی اور اصلاحی کاموں کی وجہ سے اپنا اک امتیاز رکھتی ہے۔ اسی بستی کے ایک فرزندِ ارجمند مولانا محمد ادریس نگرامی رحمہ اللہ (م: ۱۹۱۲ء) تھے، جنھوں نے تعلیم و تدریس، تصنیف و تالیف اور اصلاح وارشاد کے میدانوں میں قابلِ قدر خدمات انجام دیں، نگرام اور اس کے اطراف کے علاوہ اودھ کے دیگر قصبات و دیہات میں اک خلق کو متاثر کیا، اور بالخصوص عقائد و نظریات کی اصلاح کے باب میں ان کی خدمات ناقابلِ فراموش رہیں۔ وہ خانوادۂ نگرام کے جدامجد مولوی حافظ عبدالعلی صاحب رحمۃ اللہ کے فرزند ارجمند، مولانا عبدالحی لکھنویؒ کے شاگرد رشید اور اور بابِ طریقت میں مولانا شاہ فضل الرحمان گنج مرادآبادی کے فیض یافتہ تھے، حضرت مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی ندویؒ ان کے بارہ میں رقم طراز ہیں:

’’مولانا محمد ادریس نگرامی کا شمار اپنے زمانہ کے مشہور و معروف عالم دین اور صاحب ارشاد بزرگوں میں تھا، وہ ایک ممتاز اور جید صاحب قلم تھے، انھوں نے اردو عربی کی بہت قیمتی کتابیں تصنیف کیں‘‘۔

مولانا رحمہ اللہ کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ اپنے دور کی ممتاز شخصیات واکابر کا تعارف مستقبل میں آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کیا جائے، جو کہ ہماری دینی تاریخ کا ایک حصہ ہے، اور مستقبل کو ماضی سے مربوط رکھنے میں بڑا ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ اس فکر کی نہ صرف یہ کہ مختلف اکابر کی جانب سے پذیرائی ہوئی؛ بلکہ اس وقت ندوۃ العلماء کے ناظم حضرت سید محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے فرمائش کی کہ وہ اس کام کو انجام دیں۔ مختلف جہات سے تائید و ترغیب پا کر انھوں نے اپنے دور کی اہم شخصیات کو خطوط تحریر کیے، اور ان سے ذاتی احوال و کوائف بھیجنے کی درخواست کی۔ الغرض ان کو ایک معتدبہ تعداد میں اپنی تحریروں کے جوابات موصول ہوئے، اور اس کی روشنی میں انھوں نے ’’تذکرہ علمائے حال‘‘ کے عنوان سے ایک متوسط حجم کی کتاب تالیف کی، جس کا مکمل نام ’’تطییب الاخوان بذکر علماء الزمان الملقب بہ تذکرہ علمائے حال‘‘ ہے۔

اس کتاب میں سواچارسو کے قریب ۱۹ویں صدی کے علماء ہند کا تعارف ہے۔ یہ تراجم انتہائی جامع اور مختصر ہیں، بعض شخصیات کے حوالہ سے صرف دو دو چار چار سطریں ہیں، بعض کے حوالہ سے صرف اتنا مذکور ہے کہ ان کے حالات دستیاب نہیں ہوسکے؛ لیکن اکثر و زیادہ تر شخصیات کے بارہ میں تشفی بخش بنیادی معلومات ہیں، بعض اہم اور زیادہ معروف شخصیات کے بارہ میں کئی کئی صفحات درج کیے گئے ہیں، جیسے مولانا اشرف علی تھانویؒ، حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ اور خواجہ الطاف حسین حالی وغیرہ پر اچھا خاصہ مواد درج کیا گیا ہے۔ جہاں تک ہوسکا ہے شخصیات کے علمی کارناموں اور تصنیفات و تالیفات کا احصاء کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کہیں کہیں ان کے نظریات پر نقد و تعریض بھی ہے؛ لیکن اجمال کے ساتھ۔

’’تذکرہ علمائے حال‘‘ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ملک ہندوستان کے مختلف اطراف کے اور امت اسلامیہ کے مختلف مکاتبِ فکر کے نمائندوں کے لیے قلب و قالب میں جگہ دی گئی ہے، اور کسی قسم کا مسلکی، علاقائی، یا فکری و نظریاتی تعصب روا نہیں رکھا گیا ہے، بعض وہ شخصیات جو عرب سے یہاں آ کر آباد ہوئیں یا حصولِ علم کیا' ان کا بھی مفید تذکرہ موجود ہے، ایسی شخصیات میں شیخ احمد مکی اور شیخ حسین عرب محدث استاذ نواب بھوپال سید صدیق حسن خاںؒ کو شمار کیا جاسکتا ہے۔

۱۸۹۷ء میں اس کی پہلی طباعت مطبع نول کشول سے عمل میں آئی تھی، اس کے بعد ہندوستان میں یہ پہلی بار اسی خانوادۂ نگرام کے ایک فرزند، شہر لکھنؤ کی معروف شخصیت جناب عمار انیس نگرامی کی تحقیق و اضافہ کے ساتھ منظرِ عام پر آئی ہے۔

گرچہ کتاب کے اندر تحقیق و اضافہ کی وضاحت، تحریری یا علامتی طور پر نہیں ملتی، تاہم ہمارے دستِ مطالعہ میں موجود نسخہ میں ورق گردانی کرتے ہوئے نواب حبیب الرحمان خان شیروانی مرحوم کا ترجمہ نظر سے گذرا جس کے آخر میں (تلخیص: پرانے چراغ، مولانا ابوالحسن علی ندوی) درج ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعض

تراجم محقق کی طرف سے اضافہ ہیں، واللہ اعلم۔

ابھی حال ہی میں ندوۃ العلماء کے مہمان خانہ میں ناظمِ ندوہ کے بدست اس نادرالوجود کتاب کی جدید طباعت کا اجراء ہوا، جس میں اہم شخصیات نے شرکت کی اور اس کتاب کے حوالہ سے اپنے قیمتی تاثرات کا اظہار کیا۔

فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی (حکومتِ اتر پردیش) کے تعاون سے شائع ہوکر ندوۃ العلماء لکھنؤ کے قریبی مکتبوں میں دستیاب ہے۔

فقہ اسلامی - تاریخی ارتقاء اور معاصر اجتہاد

از:- ڈاکٹر محمد فہیم ندوی

عصرِ حاضر میں 'فقہِ اسلامی' اور اس کے قدیم مکاتبِ فکر کے حوالہ سے عصری طبقہ اور نوجوان نسل بڑی کشمکش کا شکار ہے۔ سوشل میڈیا پر بکثرت ایسی شخصیات ظاہر ہوچکی ہیں، جو بالقصد یا غیر ارادی طور پر امتِ اسلامیہ کا علمی وموروثی رشتہ ماضی سے قطع کر کے اپنے فہمِ دین وشریعت کو عام کرنے پر بضد اور مصر ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ان کو چودہ سو سال کے تمام درمیانی واسطے منہدم کرنے کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ اس سے بھی گریز نہیں کرتے۔

افسوس کہ امت کا اک بڑا طبقہ جو علمی و دینی شعور سے محروم ہے یا تو ان کی فکر ورائے سے متاثر ہوجاتا ہے، یا کم از کم اتنا تو ہوتا ہی ہے کہ اس کا اعتماد اپنے اسلاف کی فکر و رائے سے اٹھ جاتا ہے، اور وہ تذبذب اور اضطراب کا شکار ہوجاتا ہے۔ یہ صورتحال اس کو نہ صرف اسلاف سے بد دل کر رہی ہے؛ بلکہ سرے سے دین ہی سے برگشتہ کیے دے رہی ہے۔ اس کا راست اثر دعوت وتبلیغ اور اصلاح وارشاد کے میدان میں کی جانے والی مساعی پر بھی پڑ رہا ہے، اور ان کو بے اثر نہیں تو کمزور ضرور کر رہا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ بیرونی فکری یلغار جو مسلسل اسلام پر ہے اور عرصہ سے اپنا اثر دکھلاتی آ رہی ہے۔

اس انارکی کے ماحول میں سب سے پہلے امت کا رشتہ ماضی سے جوڑ کر، اپنے اسلاف پر اس کا اعتماد بحال کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں جو کوششیں ہو رہی ہیں' ان میں ایک مفید اور مؤثر کام محترم جناب ڈاکٹر فہیم اختر ندوی، شعبہ اسلامیات مانو، حیدرآباد کا ہے، جنھوں نے ''فقہِ اسلامی - تاریخی ارتقاء اور معاصر اجتہاد'' کے نام سے تقریباً تین سو صفحات پر مشتمل کتاب تصنیف کی ہے، جو ہمارے فقہی ورثہ، اس کا ارتقائی تسلسل، اس کی شخصیات، مکاتبِ فکر، کارنامے، صحت وثبوت، منہج وطریقِ کار، اہم تدوینی وتصنیفی کام، اور عصرِ حاضر کے متعدد اہم ترین مسائل کا معقول اور قابلِ عمل و مستند حل پیش کرتی ہے۔

مصنف موصوف ایک طویل عرصہ سے فقہِ اسلامی سے نہ صرف منسلک ہیں؛ بلکہ اس کی علمی خدمت بھی کر رہے ہیں، ان کے استناد کے لیے یہی کافی ہے کہ انھوں نے فقیہ العصر حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی صحبت وفیض کشی میں ایک طویل عرصہ گذارا ہے، دوم یہ کہ انھوں نے ندوہ سے فارغ ہوکر عصری اداروں کا رخ کیا تو وہاں بھی شعبہ اسلامیات سے منسلک ہوئے اور فقہ کو ہی اپنے مطالعہ وتحقیق کا موضوع بنایا۔ اس طویل 'فقہی سفر' سے انھوں نے کیا حاصل کیا' یہ کتاب اور فقہی موضوع پر ان کی دیگر کتابیں' اس کی آئینہ دار ہیں، اگر یہ کہا جائے کہ 'فقہ اسلامی' ہی ان کا شعار ودثار ہے' تو شاید مبالغہ نہ ہو؛ کیونکہ ان کی چالیس سے زائد نگارشات ہیں جو تقریباً سب ہی اسی موضوع سے متعلق ہیں۔

مذکورہ بالا کتاب عہدِ نبوی سے لے کر عصرِ حاضر تک فقہِ اسلامی کے سفر اور سالارانِ سفر کی کہانی بیان کرتی ہے۔ بایں طور کہ اس دوران قاری کو خوب وضاحت کے ساتھ یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ عہدِ نبوی، عہدِ صحابہ، عہدِ تابعین اور بعد کے زمانوں میں کن بنیادوں پر اور کن اصولوں کے ساتھ شرعی معاملات ومسائل کو حل کیا جاتا رہا ہے، اور آج کے جدید مسائل میں شرعی مسائل کے حل کرنے میں کس نہج اور طریقہ پر مسائل حل کیے جا رہے ہیں۔

کتاب در اصل تین ابواب پر مشتمل ہے؛

پہلا باب 'فقہِ اسلامی کا تاریخی بیانیہ' رکھتا ہے، اس کے ضمن میں مروجہ وغیر مروجہ فقہی مکاتبِ فکر ومصادرِ شریعت پر اچھی خاصی بحث آ گئی ہے، اور خاص طور پر ثانوی مصادر جیسے اجماع وقیاس اور استحسان و استصحاب، استصلاح و سد ذرائع وغیرہ جن سے عام مثقف طبقہ بھی واقف نہیں ہے' ان کی متعدد مثالیں عہد نبوی اور عہد صحابہ سے دے کر' ان کے تصور کو خوب واضح اور مدلل کر دیا گیا ہے، فقہی مکاتبِ فکر میں مذاہبِ اربعہ کے ساتھ سلفی مکتبِ فکر اور شیعی مکتبِ فکر کا تعارف بھی کرایا گیا ہے۔ اس کے بعد ہندوستان میں اسلامی قانون کی تنفیذ کا ذکر ہے اور آخر میں فقہی اختلاف کے اسباب کی علمی وجہ بیان کرتے ہوئے، اس سے تعامل کے آداب کا ذکر کرتے ہوئے وہ شکوک وشبہات دور کر دیے گئے ہیں جو

آج کل عام مسلمان کے ذہن میں مختلف مذاہب فقہ کے حوالہ سے رہتے ہیں۔

دوسرے باب میں ’اجتہاد‘ کا عام فہم تعارف کراتے ہوئے معاصرین فقہاء کے جدید رجحانات اور اہم ترین عصری مسائل کے حل کے سلسلہ میں ان کی کوششوں اور طریقوں کا ذکر ہے۔

آخری اور تیسرے باب میں چند جدید مسائل جیسے سونے اور چاندی کا نصابی فرق، الیکشن کی شرعی حیثیت، قیدیوں کے حقوق، شہریت کا اسلامی تناظر، سوشل میڈیا اور اسمارٹ فون، کلوننگ، تہذیبی مظاہر میں دیگر اقوام سے مشابہت وغیرہ مسائل اور جدید فقہی اجتہاد کی روشنی میں انکے حوالہ سے شرعی نکتۂ نظر پیش کیا گیا ہے۔

عام فہم زبان میں کتاب کا اسلوب معروضی ہے، اسلامیات کی شدھ بدھ رکھنے والا کوئی بھی اردو داں شخص اس کو آسانی سمجھ سکتا ہے، اور اس کے مضامین کو ہضم کرسکتا ہے۔

ذیلی حاشیوں سے بھی اجتناب برتتے ہوئے حوالۂ مباحث کے آخر میں دیے گئے ہیں، جس کا راست فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مضامین کے مطالعہ و فہم میں تسلسل قائم ہوجاتا ہے۔

ہم امید کرتے ہیں کہ فاضل مصنف کی یہ کتاب بھی ان کے دیگر کاموں کی طرح مقبول ہوگی، فقہی ذوق رکھنے والوں کے لیے نافع ہوگی، اور بہ طورِ خاص امت کے عصری طبقہ کے لیے چشم کشا اور بصیرت افروز ثابت ہوگی۔

قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، دہلی نے شائع کی ہے۔ رابطہ کے لیے: ۹۳۱۵۱۷۷۳۹۹

اسلامی نظامِ اقتصاد میں انسانی مساوات

مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ

زکوٰۃ نکالنے والے میں لالچ، حرص، طمع اور ان جیسے دوسرے مہلک امراض کم پائے جاتے ہیں، ناجائز مال کی خواہش نہیں ہوتی ہے، اس کے برخلاف سود، رشوت وغیرہ میں حرص انتہائی درجہ کا ہوتا ہے، مال کو سینت سینت کر رکھنے اور اس میں برابر اضافہ کرتے رہنے کا شوق حد سے زیادہ پایا جاتا ہے، اپنی خاطر دوسروں کی زندگی کو آگ میں جھونکتا ہے، جو حقیقت میں مدد کے مستحق ہوتے ہیں ان ہی کے مال کو ہڑپ کیا جاتا ہے، ان کے خون سے اپنی پیاس بجھائی جاتی ہے، گندا مال ماچس کی تیلی ہے اگر اس کے مسالہ کو کھرچ دیا جائے تو کسی طرح کا خوف وخطرہ باقی نہیں رہتا، اسی طرح زکوٰۃ کے عمل سے آتش گیر مادہ کو نکال دیا جاتا ہے، یہ طریقہ صرف اسلام کا بتلایا ہوا اور اس کا رائج کردہ طریقہ ہے، اس طریقہ سے معیشت سے اس سرمایہ داری کی جڑ کٹ جاتی ہے جس نے غریبوں کی لاشوں پر اپنی بلند وبالا عمارتیں تعمیر کیں اور ان کا خون چوس کر اپنے بینکوں کی تجوریاں بھریں، آج بھی ان بے گور وکفن فقیروں اور مسکینوں کے بل پر دادِ عیش دیتے ہیں۔

مادیت کے اس سیلاب میں انسان کو جس چیز کی جتنی زیادہ ضرورت تھی، اللہ تعالیٰ نے وہ چیز اتنی زیادہ وقف عام کردی تاکہ ہر انسان اس سے فائدہ اٹھا سکے، روشنی، پانی، ہوا وغیرہ، اس کے علاوہ سونا، چاندی وغیرہ کے سلسلہ میں بھی قانون وراثت اور دوسرے حقوق بیان کرکے اس مادی دولت کو انجماد سے بچا لیا اور سرمایہ دارانہ نظام کی مضرت رسانی سے پورے معاشرہ کو محفوظ کرلیا، کمیونزم نے غرباء ومساکین کی دیکھ بھال، اس سے قلبی لگاؤ اور محبت کا خوب ڈھنڈورا پیٹا، لیکن دنیا جانتی ہے کہ اس کا کیا نتیجہ نکلا، جن ملکوں نے اس کے نظام کو زبردستی رائج کیا، وہاں کا انسان لقمہ لقمہ کو ترس گیا، آخر کار اللہ تعالیٰ سے بغاوت کرنے والے، ترقی پسندی کا دم بھرنے والے اور غیر فطری اشتراکیت کا علم اٹھانے والے خود ہی کمیونزم کے لاشہ بے جان کو اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے دو گز زمین کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔

آج بھی اگر کوئی اقتصادی اور رفاہی نظام دنیا کو صحیح اقتصادی خوشحالی کی طرف گامزن کرسکتا ہے تو وہ صرف اسلامی اقتصادی نظام ہے جس میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہے، ترقی وکامرانی ہے اور فطری انسانی مساوات ہے۔

فقہی مسائل

سوال وجواب

مفتی محمد ظفر عالم ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

سوال: کوئی مکان یا پلاٹ سودی بینک کو فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: اگر بینک کا اکثر سرمایہ حرام نہیں ہے تو بینک کے ہاتھ فروخت کرنے کی گنجائش ہے لیکن اس میں چونکہ سودی کاروبار ہوگا اور فروخت کرنے والے کو اس کا یقینی علم ہو تو یہ صورت کراہت سے خالی نہیں؟

"قلت: وأفاد كلامهم ان ما قامت المعصية بعينه يكره بيعه تحريماً والاتنزيهاً".

[ردالمحتار: ۶/۳۶۸، باب البغاة]

سوال: اگر پلاٹ، مکان، دکان وغیرہ کی نقد قیمت ایک ہو اور اقساط پر اس سے زائد مثلاً ایک پلاٹ نقد ۵۰ ہزار میں اور ۱۲ ماہ کی اقساط پر ۷۰ ہزار میں ملتا ہو تو کیا اس طرح پلاٹ اقساط پر خریدنا جائز ہے؟

جواب: دونوں قیمتوں میں سے کسی ایک پر معاملہ طے ہو جائے، اور اس کی ادائیگی کی شرط ہو خواہ قسطوں والی قیمت طے ہو یا نقد تو اس طرح خرید وفروخت جائز ہے۔

أما الأئمة الأربعه وجمهور الفقهاء والمحدثين فقد أجازوا البيع المؤجل بأكثر من سعر النقد بشرط أن يبت العاقدين بأنه بيع مؤجل بأجل معلوم بثمن متفق عليه عند العقد.

[بحوث في قضايا معاصرة ص ۷]

سوال: ناجائز طریقے سے آئی ہوئی رقم غلطی سے استعمال ہو جائے تو کیا حکم ہے؟

جواب: اگر کبھی غلطی سے کوئی ناجائز طریقے سے حاصل کی ہوئی رقم استعمال میں آجائے تو توبہ اور استغفار کرنا چاہیے اور تلافی کے لیے اتنی رقم صدقہ کر دینا چاہیے؛ لیکن اگر استعمال کرنے والا محتاج ہو تو صدقہ کرنے کی ضرورت نہیں، خود استعمال کر سکتے ہیں۔

والملك الخبيث سبيله التصدق به ولو صرفه في حاجة نفسه جاز، ثم إن كان غنياً تصدق بمثله وإن كان فقير الا يتصدق.

[الاختيار لتعليل المختار: ۳/۶۱]

سوال: کیا کاروبار میں نفع کی کوئی حد متعین ہے؟

جواب: کاروبار میں شرعاً نفع کی کوئی حد متعین نہیں ہے؛ البتہ دھوکا نہیں ہونا چاہیے، پھر اپنے حالات کے لحاظ سے جتنا نفع کوئی لینا چاہے اس پر شرعاً کوئی پابندی نہیں ہے۔

من اشترى شيئاً وأغلى في ثمنه جاز.

[الفتاوى الهنديه ۳/۳۱]

سوال: نوکاسٹ ای ایم آئی (NO cast EMI) کی سہولت سے فائدہ اٹھانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: نوکاسٹ ای ایم ائی (no cast EMI) کی سہولت سے فائدہ اٹھانے کی اس وقت گنجائش ہے جبکہ یہ اطمینان ہو کے وقت پر قسطیں ادا کر دی جائیں گی، البتہ پروسینگ فیس لینے کی صورت میں جواز اس شرط کے ساتھ مقید ہوگا کہ وہ فیس متعین اور واجبی ہو۔

[تجویز بیسواں فقہی سیمینار ادارۃ المباحث الفقہیہ ۱-۳/اکتوبر ۲۰۲۵ء، حیدرآباد]

سوال: بینک سے قرض لے کر مکان تعمیر کرنا کیسا ہے؟

جواب: اگر کسی کے پاس اپنا ذاتی مکان نہیں ہے اور نہ ہی مکان بنانے کے بقدر رقم ہے یا غیر سودی قرض حاصل نہیں ہو رہا ہے کہ اس کے ذریعہ اپنا مکان بنائے تو ایسی صورت میں گورنمنٹ یا بینک سے سودی قرض حاصل کر کے ایسا مکان بنانا جائز ہے جس سے ضروری حد تک اس کی رہائش کی ضرورت پوری ہو جائے۔

ويجوز للمحتاج الاستقراض بالربح.

[الأشباه والنظائر: ص ۱۱۵]

سوال: ایجوکیشنل لون (educational loan) لے کر پڑھائی کرنا کیسا ہے؟

جواب: اگر کوئی طالب علم کسی خاص نوعیت کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا اہل ہو اور خود اس کے پاس اتنے پیسے نہیں ہوں کہ وہ قرض لیے بغیر تعلیم حاصل کر سکے اور اس مقصد کے لیے کسی اور جگہ سے غیر سودی قرض حاصل کرنے سے بھی قاصر ہو اس کے لیے ایجوکیشن لون لینا درست ہے کیونکہ حاجت کے مواقع پر اس طرح کا سودی قرض لیا جا سکتا ہے۔

[کتاب الفتاوی: ۱۰/۴۴]

گوشہ بیاد مولانا ڈاکٹر نذیر احمد ندوی رحمۃ اللہ علیہ (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

مسجد ندوۃ العلماء میں اساتذہ وطلباء اور کارکنانِ ندوہ کی موجودگی میں تعزیتی خطابات (مؤرخہ ۸/اکتوبر ۲۰۲۵ء، بروز بدھ)

نہ ستائش کی تمنا، نہ صلہ کی پرواہ

خطاب: حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی

ضبط وپیشکش: محمد ابوالحسن (عالیہ رابعہ شریعہ)

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام علىٰ سيد المرسلين وخاتم النبيين سيدنا ونبينا ومولانا محمد وعلىٰ آله وصحبه أجمعين أما بعد، فأعوذ بالله من الشيطان الرجيم، بسم الله الرحمٰن الرحيم: {فَمِنۡهُم مَّن قَضَىٰ نَحۡبَهُۥ وَمِنۡهُم مَّن يَنتَظِرُۖ وَمَا بَدَّلُوا۟ تَبۡدِيلٗا} صدق الله العظيم۔

حضرات اساتذۂ کرام اور عزیز طلبہ!

محترمی مولانا نذیر احمد ندویؒ کے حادثۂ وفات نے سب کے دلوں پر اثر ڈالا، وہ عرصہ سے بیمار تھے اور ان کی بیماری کا سلسلہ بڑا طویل رہا، لیکن انہوں نے کبھی بیماری سے ہار نہیں مانی اور ان کے ذمہ جو بھی کام تھے وہ انہیں پوری طرح انجام دیتے رہے، ابھی چند ماہ قبل وہ ہسپتال میں زیر علاج تھے، لیکن وہاں سے بھی وہ تھوڑی دیر کی چھٹی لے کر دار العلوم میں پڑھانے آجاتے تھے۔

سچی بات یہ ہے کہ طلبہ کے ساتھ اس قدر ہمدردی اور تدریس کا یہ ذوق اب عنقا ہوتا جا رہا ہے، اداروں کے لیے سب سے قیمتی جوہر اس کے ماہر اساتذہ ہوتے ہیں، جن اداروں کو اچھے اساتذہ میسر ہوں، ان کے لیے یہ بات قابل فخر ہے، اس کے ذریعہ بڑے اچھے نتائج سامنے آتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ دار العلوم ندوۃ العلماء کو شروع دور سے بڑے باکمال اساتذہ ملے، جو دردر کھنے والے تھے، انہی اساتذہ کی فہرست میں ایک نام مولانا نذیر احمد صاحب کا بھی ہے۔

مولانا اصلاً مدرس تھے، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو دین کا ایک درد دیا تھا، دعوتی کاموں میں بھی وہ اپنا وقت لگاتے تھے، مضمون نگاری کا بھی انہیں اچھا ذوق تھا، انہوں نے بہت سے مضامین بھی لکھے ہیں، خاص طور پر اللہ نے انہیں عربی زبان میں مہارت عطا فرمائی تھی، ندوہ میں فراغت کے بعد ہی سے وہ "الرائد" سے منسلک ہو گئے تھے، وہ اس کی پروف ریڈنگ کا کام کرتے تھے اور اس کے علاوہ زبان کی نوک پلک درست کرنے کا کام بھی مستقل وہی کرتے تھے، یہاں تک کہ ان کے بڑے اساتذہ یہ بات کہتے تھے کہ جب مضمون چھپنا ہو تو مولوی نذیر صاحب کو ضرور دکھا دیا جائے، ظاہر ہے یہ ان کے لیے ایک تمغۂ امتیاز تھا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو یہ ساری خوبیاں عطا فرمائیں، مگر یہ بات کہی جاتی ہے کہ جو درخت پھل دار ہوتا ہے وہ جھکتا ہے، مولانا کا معاملہ بھی یہی تھا، ان کے یہاں بھی ترفع کا کوئی شائبہ نظر نہیں آتا تھا، وہ انتہائی متواضع تھے، اللہ نے انہیں ذکر وشغل کی دولت سے بھی خوب نوازا تھا، حیرت ہوتی تھی کہ لوگ بیٹھے باتیں کر رہے ہیں اور ان کی زبان ذکر سے تر ہے، میں نے خود یہ دیکھا کہ وہ مجلس میں بیٹھے ہیں اور ان کی زبان ذکر میں مشغول ہے، عام طور سے یہ بات ان ہی لوگوں کو ملتی ہے جن کو اللہ کی سچی محبت حاصل ہو، انہوں نے شروع سے اپنے بزرگوں سے تعلق رکھا اور وہ زندگی گذاری جو زندگی مطلوب ہے، ہمارے مدارس کے اساتذہ، معلمین ومربیین کے لیے آج ان صفات کو اپنانے کی ضرورت ہے، اللہ کا فضل ہے کہ اس نے مولانا کو یہ ساری صفات عطا فرمائی تھیں، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ طلبہ نے ان سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

مولانا نے تقریباً ۳۷-۳۸/سال تک دار العلوم میں تدریسی خدمات انجام دیں، ہمارے طالب علمی کے آخری دور میں وہ ندوہ کے مدرس بن چکے تھے، اس پوری مدت میں ہم نے یہ محسوس کیا کہ ان کے ابتدائی دور میں بھی طلبہ ان سے بہت متاثر تھے، ہمارے عزیز مولانا محمود حسن حسنی مرحوم کے متعلق ہمیں یاد ہے کہ وہ ان سے الگ سے انشاء پڑھتے تھے اور ان سے بڑا فائدہ اٹھایا۔ اس وقت سے لے کر آج تک اپنی صحت کی کمزوری کے باوجود انہوں نے جس طرح طلبہ کو گھول کر پلایا اور فائدہ پہنچایا' یہ ان کی بڑی خصوصیت ہے، لیکن ان کے اندر کبھی بھی یہ احساس پیدا نہیں ہوا کہ ہمیں کوئی بڑا کمال حاصل ہے اور ہمیں کوئی بڑا

مقام حاصل ہونا چاہیے، نہ کبھی انہوں نے اس کی تمنا کی، یہ مشہور مصرعہ ان پر صادق آتا تھا کہ ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پرواہ

ہر کام وہ اللہ کے لیے کرتے تھے، ادھر چند دنوں سے ان کی بیماری کا سلسلہ چل رہا تھا اور وہ بیماری خاصی بڑھ گئی تھی، لیکن اس کے باوجود وہ تدریس کے عمل سے وابستہ رہے، یہاں تک کہ آخری دن بھی یہ معمول بدستور جاری رہا۔ ہمیں یہ دعا سکھائی گئی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمارے آخری وقت کو بہتر بنائے، اللہ نے ان کی وہ دعا قبول فرمالی، وہ صبح تدریس کے لیے تشریف لے گئے اور دو گھنٹے پڑھائے بھی، پھر وہ واپس آئے اور کچھ ہی دیر میں وہ اللہ کے حضور حاضر ہو گئے۔

حدیثوں میں یہ تذکرہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فضیلت علم کے سلسلہ میں یہ بات ارشاد فرمائی کہ: "کن عالماً أو متعلماً أو محباً أو متبعاً ولا تكن الخامس فتهلك۔"

(جامع بیان العلم وفضلہ: ۲۹)

(عالم بنو، یا متعلم بنو، یا علم سے محبت کرنے والے بنو یا علم کی پیروی کرنے والے بنو اور پانچواں (اس کے علاوہ) کچھ مت بنو ورنہ ہلاکت میں پڑ جاؤ گے۔)

یہ حدیث ہمیں بتاتی ہے کہ کسی نہ کسی حیثیت سے علم سے اشتغال رہنا چاہیے، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آدمی عالم ہے اور عالم وہی ہے جو معلم ہے، اگر آدمی عالم ہے اور معلم نہیں ہے تو سچی بات یہ ہے کہ علم کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے، اگر دیکھا جائے تو مولانا جب سے عالم ہوئے تب ہی سے معلم بھی بن گئے اور آخری دن تک وہ یہ فریضہ انجام دیتے رہے، یہاں تک کہ دنیا سے رخصت ہونے والے دن بھی انہوں نے اپنی ذمہ داری پوری کی۔

یہ بھی ان کے لیے بڑی خوش قسمتی کی بات ہے کہ ان کا انتقال ایسے وقت میں ہوا کہ ان کے ذمہ کوئی نماز ایسی نہ تھی جو رہ گئی ہو، انہوں نے نماز فجر ادا کی اور ظہر کی اذان سے قبل ہی ان کا انتقال ہو گیا، اللہ نے انہیں ہر لحاظ سے حسن خاتمہ عطا فرمایا، دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اللہ نے انہیں کیسا پرنور چہرہ دیا، ایک طویل بیماری کے باوجود بھی انہوں نے کبھی شکوہ وشکایت سے کام نہیں لیا، کچھ زمانہ پہلے ان کے ہاتھ میں فریکچر ہوا، پھر جلد ہی صحت یاب ہو کر انہوں نے دوبارہ پڑھانا شروع کر دیا۔

سچی بات یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جن صفات سے مولانا کو نوازا تھا' وہ اس دور میں عنقا ہوتی چلی جا رہی ہیں، ہمارے اساتذہ وطلبہ کے لیے اس میں بہت کچھ روشنی ہے، ہمارے درمیان ہو سکتا ہے بعض حضرات وہ بھی ہوں جو مولانا کے اساتذہ کی صف کے ہوں اور ایک بڑی تعداد تو یقیناً ان کی موجود ہے جو ان کے شاگرد ہیں، یہ رشتہ چاہے استاد کا ہو یا شاگرد کا' بڑا گہرا اور قیمتی رشتہ ہوتا ہے، اگر اس رشتہ میں قوت پیدا ہو تو آدمی علم میں ترقی کرتا ہے۔

مولانا نے سب سے زیادہ حضرت مولانا واضح رشید حسنی ندویؒ سے فائدہ اٹھایا، گویا کہ ان کو جذب کر لیا، مولانا واضح صاحب کا انداز فکر، انداز تحریر اور ان کی جو بصیرت تھی، وہ ساری چیزیں مولانا نے اختیار کرنے کی کوشش کی اور وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے، اسی طرح مولانا واضح صاحب کے اندر کم گوئی، اخلاق کی بلندی، مردم سازی اور مردم گری کی جو صفات تھیں، اللہ نے مولانا نذیر صاحب کو ان کی یہ صفات بھی عطا فرمائیں، الحمد للہ مولانا کی ذات سے ایک بڑی تعداد نے فائدہ اٹھایا۔

اللہ کے نبی ﷺ کے دور سے اساتذہ کا یہ سلسلہ جاری ہے، سب سے پہلا مدرسہ دار ارقم تھا، پھر صفہ نبوی تھا اور اس کے سب سے پہلے معلم سرکار دو عالم ﷺ تھے، آپ ﷺ نے یہ بات ارشاد فرمائی کہ "إنما بعثت معلماً" (ابن ماجة: ۲۳۴) (بلا شبہ مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے۔)

یہ سلسلہ وہاں سے چلا، چل رہا ہے اور قیامت تک چلے گا۔ اس دین کی حفاظت واشاعت کا اصل کام ہمارے علماء کا ہی ہے۔ مولانا نے اپنی پوری زندگی اسی مبارک کام میں کھپائی، ہمیں امید ہے کہ ان شاء اللہ یہ چیز ان کے لیے سرخ روئی کا ذریعہ ہوگی، حدیث میں آتا ہے کہ دنیا میں جو گواہ بنتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی گواہی قبول کرتا ہے، اس میں کیا شبہ ہے کہ ہزاروں لوگوں نے ان کی پاکیزہ زندگی، قربانیوں والی زندگی کی گواہی دی، واقعہ یہ ہے کہ اللہ نے انہیں عجیب شکستہ دلی عطا فرمائی تھی جو کم لوگوں میں ہوتی ہے، وہ ایسے شکستہ دل تھے کہ انہوں نے کبھی کسی کا دل توڑنا سیکھا ہی نہیں، خود ان کا دل ٹوٹتا رہا مگر اس کے نتیجہ میں وہ اللہ سے قرب حاصل کرتے رہے، ایک حدیث قدسی میں آتا ہے کہ: "أنا عند المنكسرة قلوبهم" (جامع العلوم والحكم، الحديث التاسع عشر: ۴۲) (میں ٹوٹے ہوئے دلوں کے پاس ہوتا ہوں)۔

وہ اپنے گھر والوں سے دور ندوہ میں تنہا رہتے تھے، لیکن انہوں نے کبھی کوئی شکایت نہیں کی، جو کام ان کے ذمہ ہوتے تھے' وہ انہیں ہمیشہ بہتر سے بہتر طریقہ پر ادا کرتے رہے، مولانا علاء الدین صاحب ندوی جو کلیۃ اللغۃ العربیۃ کے عمید ہیں، انہوں نے یہ بات کہی اور ان کی گواہی بڑی اہم ہے کہ وہ سفروں میں بھی ان کے ساتھ رہے اور ان کا مشاہدہ ہے کہ کس طرح ان کی زندگی گذرتی تھی۔

میں نے ایک دفعہ کیرلا میں ان کی ایک تقریر عربی میں سنی تو مجھے تعجب ہوا، انہوں نے روانی کے ساتھ ایسی شستہ تقریر کی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں عربی زبان پر کیسی قدرت عطا فرمائی تھی، یقیناً وہ اس کے ماہر تھے اور لکھنے

میں بھی انہیں بڑی مہارت حاصل تھی، خاص طور پر زبان کی نوک پلک درست کرنے کے کام میں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ وہ لاثانی تھے اور اس فن کے ممتاز ترین افراد میں ان کا شمار ہوتا تھا، اس کے علاوہ اردو اور ہندی زبان میں بھی انہیں مہارت حاصل تھی، انگریزی زبان بھی اچھی طرح جانتے تھے، مجھے معلوم ہوا کہ بعض جگہوں پر وہ بلائے گئے تو انہوں نے انگریزی میں بھی برجستہ تقریریں کیں اور الحمدللہ لوگوں کو ان سے نفع ہوا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ سنسکرت سے بھی ان کو خاصی شدبد تھی اور بعض طلبہ نے ان سے اس میں استفادہ کیا۔

اگر ہم انہیں جامع الکمالات شخصیت کہیں تو غلط نہ ہوگا، اللہ نے ان کو بہت سی خوبیاں عطا فرمائی تھیں، دعوت کا مزاج دیا تھا، دعوت کے وسائل میں اپنی بات کو پیش کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ زبان وبیان کی قدرت ہے، اگر آدمی اپنی بات پیش نہیں کرسکتا اور وہ زبان وبیان پر قدرت نہیں رکھتا اور سب سے بڑھ کر اگر وہ مقامی زبان سے واقف نہیں، یا وہ مخاطب کی زبان سے واقف نہیں، تو وہ دین کی صحیح ترجمانی نہیں کرسکتا، آج سب سے بڑھ کر اس بات کی ضرورت ہے کہ آدمی ان وسائل کو اختیار کرے جن کے ذریعہ سے تبلیغ دین کا کام ہوسکے اور اس سے بڑھ کر طالب علمی کے زمانہ میں دین کا صحیح مزاج پیدا کرے جس کو قرآن مجید میں تفقہ فی الدین کہا گیا ہے، یہ ہماری سب سے بڑی ذمہ داری ہے۔

مولاناؒ کی زندگی اس بات میں بھی ہمارے لیے نمونہ ہے اور ان مجالس اور تعزیتی جلسوں کا یہی پیغام ہے، ان کا اصل بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہم جانے والے کی خوبیاں صرف یاد ہی نہ کریں بلکہ ان خوبیوں سے اپنے آپ کو آراستہ کرنے کی کوشش کریں، آج کا یہ اجلاس حقیقت میں ہمیں یہی سبق دیتا ہے، آپ کے سامنے پہلے بھی بہت مفید باتیں آئی ہیں اور آپ میں سے بہت سے ہمارے عزیز طلبہ ایسے ہیں جنہوں نے مولانا کے ساتھ بڑا وقت گذارا ہے، وہ ان کے محاسن سے خوب واقف ہیں، آپ ان سے سبق لیں، ان سے فائدہ اٹھائیں اور یہ طے کریں کہ ہمیں دوسری زبانوں میں مہارت حاصل کرنی ہے، اس کے ساتھ دین کا درد پیدا کرنا ہے اور دین کی صحیح ترجمانی کرنی ہے، اس وقت پوری دنیا کے جو حالات ہیں، ان حالات میں میں سمجھتا ہوں کہ اس کی ضرورت سب سے زیادہ ہے اور میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ ندوۃ العلماء کی اس چہاردیواری میں آپ کو جو سبق دیا جاتا ہے، ندوۃ العلماء کا جو مشن اور پیغام رہا ہے، اس کی سب سے بڑی ذمہ داری آپ حضرات پر عائد ہوتی ہے، آپ یہاں سے یہ سبق لیں اور مولانا کی زندگی سے بھی یہ سبق حاصل کریں، آپ یہاں سے یہ پیغام لے کر جائیں اور اس جلسہ کو روایتی جلسہ نہ سمجھیں، بلکہ یہ سمجھیں کہ یہ جلسہ ہماری زندگی کے لیے ایک تحفہ ہے، ہمیں یہاں سے ایک پیغام لے کر جانا ہے، انشاء اللہ ہم محنت کریں گے، زبان وبیان میں قدرت پیدا کریں گے، اپنے اخلاق کو سنواریں گے، آپ یاد رکھئے! اگر ہم نے صحیح دینی زندگی اختیار نہیں کی اور ہم مدرسوں میں آکر تعلیم حاصل کررہے ہیں تو ہم کبھی پورا فائدہ نہیں اٹھا سکتے، بلکہ ہوسکتا ہے کہ ہمیں اس کا نقصان بھی بھگتنا پڑے اور جب ہم میدان عمل میں آئیں تو خالی ہاتھ ہوں۔

مولانا کی زندگی میں یہی پیغام ہے، ہمیں اپنی زندگی کو سنوارنا ہے، ہمیں اپنے رخ کو درست کرنا ہے، اپنی ناہمواریوں کو دور کرنا ہے، اپنے وقت کو مرتب کرنا ہے اور اس مرتب زندگی کو گذار کر اس طرح تیار ہوکر میدان عمل میں آنا ہے کہ جو افراد کار اس وقت کی ضرورت ہیں پوری دنیا کے لیے اور خاص طور پر اس ملک کے لیے کہ وہ اپنے اخلاق سے لوگوں کو متاثر کریں، اپنے کردار سے متاثر کریں، پھر اپنی گفتار سے بھی متاثر کریں، ان کے اندر قوت بیانیہ بھی ہو، لکھنے کی بھی طاقت ہو، پھر مختلف زبانوں کے اندر بھی مہارت ہو، یقیناً دین کی ترجمانی سب سے بڑا فریضہ ہے، اللہ کا شکر ہے کہ مولانا کی زندگی میں آپ کے لیے ایک نمونہ ہے، ہم امید کرتے ہیں کہ آج کا یہ اجلاس آپ کو ایک پیغام دے گا، ایک نئے حوصلے کے ساتھ آپ زندگی کا سفر شروع کریں گے اور یہ طے کریں گے کہ انشاء اللہ اپنے وقت کو ضائع نہیں کرنا ہے، بلکہ ایک مرتب زندگی گذارنی ہے تاکہ جب ہم میدان عمل میں آئیں تو ہماری زندگی ایک نمونہ ہو، ایک چراغ ہو، ایک روشنی ہو، جس سے عالم میں اس وقت جو ظلمتیں پھیلی ہوئی ہیں، وہ ظلمتیں دور ہوں، اس ملک میں بھی ضرورت ہے دعوت کی، اپنے برادران وطن تک صحیح بات پہنچانے کی جو بڑی غلط فہمیوں کا شکار ہیں، ہماری اخلاقی زندگی، ہماری ایمانی بصیرت اور ایمان کی وہ روشنی جو ہمارے چہروں سے ظاہر ہو، اللہ اس کو ان کی ہدایت کا ذریعہ بنائے، لیکن اس کے لیے ہمیں کچھ کرنے کی ضرورت ہے، آج کا اجلاس آپ کو یہی پیغام دیتا ہے کہ آپ ایک جذبہ کے ساتھ جائیں، ایک پیغام لے کر جائیں اور یہ طے کرکے جائیں کہ انشاء اللہ ہمیں بھی ایک نمونہ کی زندگی اختیار کرنی ہے اور قربانیوں کے ساتھ یہاں وقت گذارنا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے اور مولانا کو بلند مقام عطا فرمائے، ان کی قربانیوں کو قبول فرمائے، انہوں نے یہاں جس طرح وقت گذارا، اللہ اس کو وہاں کی ترقی درجات کا ذریعہ بنائے، ان کے لیے ذخیرۂ حسنات بنائے، ان کے درجات بلند فرمائے اور آپ حضرات کو ہمارے اسلاف سے، ان بزرگوں سے اور ان اساتذہ سے جنہوں نے دین کے لیے اپنی زندگیاں کھپائی ہیں، سیکھنے کا اور اس کے مطابق زندگی بنانے کا اللہ موقع دے اور اس کی توفیق بھی عطا فرمائے۔ آمین!

جامع کمالات شخصیت

خطاب: مولانا عمار عبد العلی حسنی ندوی (ناظر عام ندوۃ العلماء)

ضبط و پیشکش: محمد سعید الرحمٰن (عالیہ رابعہ شریعہ)

مولانا نذیر احمد ندوی آج جن کو رحمۃ اللہ علیہ کہنا پڑ رہا ہے، وہ ایک جامع کمالات شخصیت تھے، اللہ نے ان کو عجیب و غریب اوصاف و کمالات سے نوازا تھا، وہ علمی بھی تھے اور دینی بھی، وہ ادیب بھی تھے اور جامع الاقات بھی، اسی طرح انگریزی اور ہندی زبان پر مہارت رکھتے تھے دونوں زبان پڑھ لکھ اور بول بھی سکتے تھے۔ مجھے ایک ساتھی نے بتایا کہ میں نے ہندی اور سنسکرت انھیں سے سیکھی ہے، تعجب ہوا کہ ایک شخص جو عربی، انگریزی اور اردو زبان و ادب کا ماہر نکتہ سنج، دقیقہ رس اور اس میں درجۂ کمال رکھتے ہیں وہ ہندی اور سنسکرت کے بھی اچھے جانکار ہیں۔

مولانا مرحوم حضرت مولانا واضح رشید صاحب حسنی کے پاس آتے جاتے رہتے تھے اور ان سے استفادہ کرتے تھے، میری واقفیت ان سے روز اول سے رہی ہے، مولانا مرحوم میں بہت سے دینی خصوصیات کامل درجے کی تھیں، مثلاً وہ اعلیٰ اخلاق، ملنسار، اچھے جذبات کے حامل تھے اور دوسروں کے لیے ہمیشہ اچھا کرنے اور سوچنے کا مزاج تھا۔

مولانا مرحوم ہاسپٹل میں ایڈمٹ تھے، اس کے باوجود انھوں نے دو، تین گھنٹے کی رخصت لی اور درجے میں حاضر ہوئے اور دو گھنٹے پڑھایا، جب ان سے ذمہ داروں نے کہا کہ آپ کیوں اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں، تو انہوں نے بہت پیارا جواب دیا ''پڑھائے بغیر چین نہیں پڑتا'' مولانا کے اندر ذمہ داری کا احساس بہت زیادہ تھا، اللہ تعالیٰ ہمارے طلبہ کو بھی ان کے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

❁❁❁

تخریبِ نشیمن آساں ہے، تعمیرِ نشیمن مشکل ہے

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی

اگر سوال کیا جائے کہ کیا خطرناک تیاریاں عالم انسانی کی بہتری اور انسانی صلاحیتوں کے فروغ، زندگی و معاشرہ کو بہتر بنانے اور احساس ذمہ داری کو بیدار کرنے کے لیے کی جارہی ہیں؟ تو ہمارے اس سوال پر کوئی توجہ نہیں ہوگی اور اسے غفلت ولا پروائی کے خانہ میں ڈال دیا جائے گا اور خاطر خواہ جواب نہیں حاصل کر سکے گا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ایٹم بم بنانا، قسم قسم کے جدید ہتھیار تیار کرنا اور کام ہے، اور ایک بامقصد انسان کی تعمیر کرنا (جو اپنے مالہ وماعلیہ سے واقف ہو، اپنی علمی وتہذیبی ترقیات میں خیر وشر کے درمیان تمیز کرنے پر قادر ہو) اور کام ہے

تخریبِ نشیمن آساں ہے، تعمیرِ نشیمن مشکل ہے
تم آگ لگانا سیکھ گئے، تم آگ بجھانا کیا جانو

اس حقیقت کے اعتراف کے باوجود انسانی تعمیر کا کوئی اہتمام نہیں، جو صالح معاشرہ کی تعمیر کرے، ہاں اس کے بجائے جدید سے جدید ہتھیار ضرور تیار ہو رہے ہیں، جو انسانی نسل کشی کے لیے ہر آن تیار رہتے ہیں۔

لیکن اسلام دین اعتدال ہے، وہ میانہ روی کا حامی ہے، وہ جنگ میں اعتدال کو ملحوظ رکھتا ہے، اس کی تعلیم ہے کہ جب بہت سے گروہ آپس میں لڑنے پر آمادہ ہوں، تو ثابت قدمی سے، کثرت سے ذکر خداوندی کرنا، اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرنا، نزاع سے پرہیز کرنا جو ناکامی کا شاخسانہ ہے، پھر صبر کی تلقین کامیابی کی ضمانتیں ہیں۔

❁❁

اخلاق وکمال کا حسین امتزاج

خطاب: مولانا محمد علاء الدین ندوی (عمید کلیۃ اللغۃ العربیہ وآدابھا)

ضبط وپیشکش: صفوان بھویرا (عالیہ رابعہ شریعہ)

مولانا نذیر صاحب ایک شریف انسان تھے، اور دل موہ لینے والے انسان تھے، اللہ نے انہیں بڑی صلاحیتیں دی تھیں، ہم سے کم از کم سات سال وہ جونیئر تھے؛ لیکن ندوۃ العلماء سے شروع ہی سے وابستہ رہے۔ میں نے یہاں 1978 عیسوی میں تخصص فی الادب العربی کیا تھا، اور ادھر ادھر چکر لگانے کے بعد میں 1997ء میں یہاں آیا تو مولانا پہلے سے یہاں مدرس تھے، پھر مولانا کے ساتھ یا مولانا میرے ہمراہ کئی اسفار میں ساتھ رہے۔

اور سب سے زیادہ معاملات کے اندر اور سفر کے اندر انسان کی حقیقت سامنے آتی ہے۔ گجرات کے کئی اسفار میں ہم دونوں ساتھ رہے۔ اور سب سے بڑی بات اور میرے لیے کسی حد تک تکلیف کا باعث ہے ان کا جانا، ان کا بچھڑنا، وہ یہ ہے کہ مولانا بہت پابند انسان تھے، 1997ء سے تو میں انہیں دیکھ رہا تھا کہ وہ مستقل بیمار چلے آ رہے ہیں، اپنی بیماری کی حالت میں بھی کبھی وہ درجوں سے غائب نہیں ہوتے تھے، ہماری چھوٹی اور بڑی جو کلیہ کے سطح کی میٹنگ ہوتی تھی، ان کے پروگرام ہوتے تھے، ہر پروگرام میں وہ شریک ہوتے تھے، ان کا بڑا تعاون حاصل تھا، اس حیثیت سے میں سمجھتا ہوں کہ ایک بڑا خلا پیدا ہو گیا۔ اور درس وتدریس کے معاملے میں۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کو زبان میں تو بہت عبور حاصل تھا، عبارتوں کی نزاکتوں کو اور اس کی باریکیوں کو وہ بہت اچھی طرح سمجھتے تھے۔

لیکن یہ راز ابھی ابھی کھلا اور وہ یہ ہے کہ حضرت ناظم صاحب کے آنے کے بعد نظامت کے ایک نئے دور کا: بلکہ ایک انقلابی دور کا آغاز ہوا، تو یہاں اخیر کے تخصصات کے جو دو سال تھے اس میں جو تھوڑی بہت ہیر پھیر ہوئی، اس میں ایک باقاعدہ نصاب تخصص کا تیار کیا گیا، تو اس میں بعض ایسی کتابیں بھی داخل کی گئیں جو پہلے سے نہیں تھی، اس میں ایک کتاب "الأدب المقارن" ہے۔ اتفاق سے اس کا گھنٹہ مولانا کو لگا۔ تو ابھی میرے ذہن میں یہ بات ائی کہ مولانا نے حدیث میں تخصص کیا تھا، میں تو سمجھتا تھا کہ انہوں نے پی۔ایچ۔ڈی بھی کیا ہے، اس طرح کی چیزوں کا مطالعہ کیا ہوگا۔

"الأدب المقارن" کا آغاز روم اور یونان کی تہذیب اور ان کی ادبی کارناموں کے ذکر سے ہوتا ہے، تو یہ ہمارے مدارس کے لحاظ سے ایک عجیب موضوع ہے، غیر دلچسپ موضوع ہے، اس میں شرک کی باتیں بھی آتی ہیں، جیسے کہ ادب جاہلی کا جب مطالعہ کرتے ہیں تو ظاہر ہے اخلاقی اعتبار سے وہ چیزیں ہمارے ذہن کو اپیل نہیں کرتیں؛ لیکن قرآن کی ضرورت اور قرآن کی تفہیم کے لیے جب یہ چیزیں ضروری ہیں تو پڑھنا پڑتا ہے اور پڑھانا پڑتا ہے۔

آپ نے بارہا سنا کہ ایک عالم کی موت ایک عالَم کی موت ہوتی ہے۔ عالم کا مطلب یہ ہے کہ وہ دین اسلامی سے وابستہ ہے، عالم کا مطلب یہ ہے کہ وہ دین کی تبلیغ کر رہا ہے، اور اختصار کے ساتھ کہا جائے تو اس کی زندگی کا ہر لمحہ ذکر الٰہی میں گزر رہا ہے، چاہے وہ زبان سے ذکر اللہ نہ کر رہا ہو؛ لیکن اس کی سوچ، اس کی دوڑ دھوپ، اس کا مطالعہ کرنا، اس کا دینی کتابوں کی طرف مراجعت کرنا، یہ سب ذکر الٰہی میں آتا ہے۔ ایک عالم کے ذریعے سے جو فیض پہنچتا ہے عوام کو تو ہر عالم کی اپنی ایک الگ کائنات ہوتی ہے، ایک الگ عالَم ہوتا ہے، اور یہ عالَم آپ دیکھتے ہیں کہ اتنا بڑا عالم اتنی بڑی کائنات صرف روحانیت کی وجہ سے قائم ہے، وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی بنیاد پر نہیں قائم ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ انسان صرف روٹی پر زندہ نہیں رہ سکتا، روحانیت کے بغیر یہ کائنات قائم نہیں ہوگی۔

اسی لیے کہا گیا ہے کہ جب اللہ اللہ کرنے والا کوئی نہیں ہوگا، اس وقت قیامت قائم ہو جائے گی۔ قیامت کا قائم ہونا گویا کہ کائنات کا مرنا ہے۔ ایک انسان مرتا ہے تو محض ایک انسان مرتا ہے؛ لیکن جب ایک عالم دین مرتا ہے تو اس کا جو حلقہ ہے، وہ مختصر حلقہ بھی ہو سکتا ہے اور وسیع حلقہ بھی ہو سکتا ہے، تو وہاں سوگواری چھا جاتی ہے، اس کی ذات کی حد سے، طاعت کی توسط سے جو فیض پہنچ رہا تھا، وہ فیض پہنچنے کا سلسلہ بند ہو جاتا ہے، تو یہ ہے عالَم کی موت۔

موت کیا چیز ہے؟ مومن کے لیے موت تحفۂ حیات ہے، زندگی کا تحفہ ہے، سوغات ہے، موت وہ پل ہے، جس کو پار کر کے انسان خدا سے جا کر ملتا ہے، موت کیا ہے؟ یہ ولایت کی نشانی ہے،

یہودیوں کو چیلنج کیا گیا: "یاأیها الذین هادوا إن زعمتم أنكم أولياء لله من دون الناس فتمنوا الموت" موت کی تمنا کرو، اس لیے کہ موت ہی وہ واسطہ وذریعہ ہے جس کے ذریعہ سے تم خدا کے دربار تک پہنچ سکتے ہو۔ حضرت مولانا یعقوب مجددی صاحب کے بارے میں سنا ہے اور شاید پڑھا بھی ہے کہ حضرت کو کوئی دعا دیتا تھا کہ اللہ آپ کی عمر میں برکت عطا فرمائے تو حضرت ناراض ہوجاتے تھے اور ڈانٹنے کے انداز میں اس سے بات کرتے تھے کہ ہم تو موت کی تمنا لیے بیٹھے ہیں کہ موت آئے گی تو اللہ سے ملاقات ہوگی، تم زندگی کے لمبی ہونے کی دعائیں کر رہے ہو۔ تو یہ جو اللہ نے ارشاد فرمایا: "کل نفس ذائقة الموت" اس تعبیر کو کہنا ہو تو ہم اپنی عربی میں کہتے: "کل بشر، کل انسان، کل کائن حي سيموت" اس طرح کی عربی ہم بولتے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "کل نفس ذائقة الموت"، اور "کل نفس" مسند الیہ ہے اور "ذائقة الموت" مسند ہے۔ اور عربی کا شاعر زہیر بن ابی سلمی کہتا ہے:

وما الحرب الا ما علمتم وذقتم

موت کا تم نے ذائقہ چکھا، انسان مرتا ہے اور انسان موت کا مزہ چکھتا ہے، انسان اس دنیا سے جاتا ہے، جو بھی تعبیر اختیار کریں اس کی تعبیر اللہ نے "ذائقة الموت" سے کیا ہے۔

نفس کیا چیز ہے؟ نفس اور روح۔ نفس کے بہت سے معانی آتے ہیں؛ لیکن ایک معنی میں نفس کے روح کے معنی میں آتا ہے؛ لیکن نفس کا اطلاق اس وقت ہوتا ہے جب وہ جسم کے ساتھ جڑا ہوا ہو، تو موت کیا چیز ہوئی؟ روح کا اپنے بدن سے جدا ہو جانا، جب یہ روح اپنے بدن سے جدا ہو جاتی ہے تو اب اس کو روح سے تعبیر کرتے ہیں، اور جب تک یہ روح جسم کے ساتھ جڑی ہوئی ہوتی ہے، جسم کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے، اس وقت کہتے ہیں نفس، اس کو نفس سے تعبیر کرتے ہیں، تو ہمارے مولانا محترم مرحوم اللہ انہیں کروٹ کروٹ راحت نصیب فرمائے اور ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔ وہ ہمارے لیے اور آپ کے لیے بڑا اچھا نمونہ تھے، اللہ نے ان کی اتنی ہی زندگی مقرر فرمائی تھی۔ 59 سال کی عمر میں وہ اس دنیا سے تشریف لے گئے؛ لیکن اپنے پیچھے آپ طلبہ کی شکل میں جو ذخیرہ انہوں نے چھوڑا ہے۔ آپ بھی ان کے حق میں دعا فرمائیں، اور یہی ان کے لیے ایک بڑا صدقہ جاریہ ہے، یہی عالَم ہے، ہم تمام اساتذہ کے لیے جو استاذیت کی ذمہ داری ہم کو سپرد کی گئی ہے، تو سب سے بڑی کائنات ہمارے لیے یہی ہے، یہ تین چار ہزار کی جو جماعت ہے۔ یہ ایک عالم ہے اپنے آپ میں۔ ایک مختصر عالَم کہیے یا بڑا عالَم کہیے، ان کو تیار کرنا اور ان کو صدقہ جاریہ بنانا سب سے بڑا صدقہ ہوگا۔ یہی صدقہ جاریہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی قبر کو نور سے بھر دے۔

❁ ❁

رخصت ہوا ایک خاموش فرشتہ

عبیداللہ محی الدین اسحاقی ندوی (مکہ مکرمہ)

مولانا نذیر احمد صاحب - رحمہ اللہ - سے ہمارا رابطہ ربع صدی پہلے کا تھا، ہمارا تعلق استاذ و شاگرد کا نہیں تھا، بلکہ اخوّت فی الاسلام کا تھا، ندوۃ العلماء کو الوداع کہنے کے بعد سوء اتفاق سے پھر کبھی اور کہیں ان سے ملاقات نہیں ہوسکی، وہ ندوۃ العلماء کے باوقار، وفا شعار، خوش مزاج، خوش اخلاق، بسّام شخصیت تھی، ان کے امتیازی اوصاف وہ سب سے محبت کرنے والے، چہرہ پر ہمیشہ مسکراہٹ، تواضع وخاکساری کے پیکر تھے، حبّ جاہ، وحبّ نمود، وحبّ ظہور، وحبّ شہرت سے کوسوں دور تھے، ان کے پاس ڈاکٹریٹ کی ڈگری تھی، لیکن انہوں نے اپنے کو کبھی بحیثیتِ دکتور متعارف نہیں کروایا، اور اس کے لئے اپنے نام کے ساتھ کبھی دال کا سابقہ یا لاحقہ نہیں لگایا، اگرچہ کہ وہ ان کا ایک علمی حق تھا، انہیں ڈاکٹریٹ کی شہادہ سے زیادہ ندویت کی شہادہ ہی زیادہ عزیز تھی، اسی لئے انہوں نے دکتوراہ کی دال پر ندوۃ العلماء کی طرف انتساب کو ترجیح دی، یہ ان کی تواضع وخاکساری بھی تھی، اور اپنے مادرِ علمی وفاداری بھی تھی۔

وہ اپنے اکابر سے وابستہ، طلبہ کے محبوب استاذ، دار العلوم ندوۃ العلماء کے ایک مخلص و وفا شعار استاذ تھے، انہوں نے عربی زبان کی طویل خدمت کی، جو کم وبیش ۲۷ سالوں پر ممتد ہے، ان شاء اللہ ان کی یہ مخلصانہ طویل خدمت، اور ان کے جنازہ میں اساتذہ وطلباء ومحبّین کے جمع غفیر کی شرکت اور دعاءِ مغفرت ورحمت ان کے لئے فالِ حسن اور ذخیرۂ آخرت ہوگی، اور ان کا علمِ نافع ان کے لئے ہمیشہ صدقۂ جاریہ بنا رہے گا، جزاہ اللہ کل خیر عن الإسلام والمسلمین، اللهم آمین!

❁ ❁ ❁

خلدِ بریں کا مکیں

خطاب: مولانا محمد خالد غازیپوری ندوی (عمید کلیۃ الدعوۃ والاعلام)

ضبط وپیشکش: عاطف ممتاز (عالیہ رابعہ شریعہ)

مولانا نذیر احمد صاحبؒ اپنی ذات کے اعتبار سے اپنے کام اور نام کے اعتبار سے واقعتاً نذیر تھے، نذیر کے معنی ہی آتے ہیں متنبہ کرنے والا، لہٰذا قرآن پاک بھی کہتا ہے:

"أولم نعمّركم ما يتذكر فيه من تذكر وجاءكم النذير"۔

(کیا ہم نے تمہیں ایسی عمر نہیں دی جس میں نصیحت حاصل کر سکتے تھے، نصیحت حاصل کرنا چاہئے، اس لیے کہ تمہارے پاس نذیر آ گیا)، قرآن پاک کی اس اسلوب میں شارحین نے یہ اضافہ کیا ہے کہ نذیر سے مراد انسان کے سر، ڈاڑھی اور جسم کے بال جب سفید ہونے لگیں تو یہ نذیر ہے، یعنی اب رخصتی کا وقت آ رہا ہے، دنیا رہنے کی جگہ نہیں ہے؛ لیکن کمال یہ ہے کہ جب جائے تو لوگ اس کو یاد کریں:

یہ کمالِ زندگی ہے کہ جب آفتاب ڈوبے
تو فلک کو نور دے کر نئی انجمن سجا دے

لہٰذا اس موقع پر تعزیتی جلسوں کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ جانے والے کے جو محاسن ہیں، جانے والے کے جو خوبیاں ہیں جانے والے کے جو اوصاف وخصوصیات و امتیازات ہیں ان کو سامنے لایا جائے پیش کیا جائے تا کہ رہنے والے ان سے استفادہ کریں جنہیں نور کی ضرورت ہے، روشنی کی ضرورت ہے، علم کی ضرورت ہے، کردار کی ضرورت ہے، گفتار کی ضرورت ہے اور زندگی منزل سے ہم آہنگ کرنے اور مقاصد تک پہنچنے کے لیے سرگرم زندگی گزارنے کی ضرورت ہے اسی لیے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اذكروا محاسن موتاكم (اپنے گزرے ہوئے لوگوں کے محاسن کا تذکرہ کرو)۔

اور یہ تعزیتی جلسہ یونہی نہیں یہ مادر علمی کا جلسہ ہے، ترمذی شریف کی روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من عزى شكلى كُسي بردأفي الجنة۔

غور کریں اس حدیث پر کہ ماں کو جس کا بیٹا رخصت ہو گیا ہو۔ آج مولانا نذیر صاحب اس ماں کے بیٹے ہیں یا نہیں؟ ابنائے ندوہ کے سپوت میں سے ہیں یا نہیں؟ وہ سپوت میں سے ہیں، **من عزى شكلى** ایسی ماں جس کا بیٹا رخصت ہو گیا ہو، موت نے اس کو رخصت کر دیا ہو، اس کے لیے چند الفاظ تعزیت کے تسلی کے دل بستگی کے کہے جائیں تو اللہ تبارک وتعالیٰ جنت میں اسے شال اعزاز کا اڑھائیں گے، ہمیں یقین ہے کہ یہ تعزیتی جلسہ بافیض ہوتے ہیں اور حدیث سے ثابت ہے کہ ہم اس کا تذکرہ کریں، لہٰذا آج حضرت مولانا ڈاکٹر نذیر احمد صاحب مرحوم کے جو محاسن ذکر کیے گئے ہیں، یقیناً ہم آج سے نہیں بلکہ جب وہ یہاں سے فارغ ہوئے 86 میں اور اس کے بعد "الرائد" سے وابستہ ہوئے اور جیسا آپ نے سنا کہ نوک و پلک اور قلم و قرطاس کے دھنی بننے کے لئے اللہ رب العزت نے اپنے فضل و کرم سے حضرت مولانا سید محمد واضح رشید ندوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسا استاذ، شیخ اور کرم فرما ان کو نصیب کیا، اس کی بنیاد پر ان کا اشہب خامہ تیز گام رہا اور وہ ہر جگہ اس کی بنیاد پر پہچانے گئے۔

آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں کل ہم بھی نہیں رہیں گے، اس لیے کہ ہم سب مدت پوری کرنے کے لیے آئے ہیں کام پورا کرنے کے لیے نہیں آئے ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: **"وهو الذي يتوفاكم بالليل ويعلم ما جرحتم بالنهار ثم يبعثكم فيه ليقضى أجل مسمى"۔**

وہ ذات ہے جو موت کی نیند تمہیں رات میں سلاتا ہے، اس وجہ سے کہ دن کے اندر تم نے کیا کیا کام انجام دیا ہے پھر وہ دوسرے دن تمہیں اٹھاتا ہے تا کہ تم مدت پوری کرو، لہٰذا ہر شخص ایک مدت لے کر آیا ہے، زندگی کی مدت، عمر کی مدت، لہٰذا اس مدت کو پوری کر کے اسے جانا ہے، اور موت یقیناً عطیہ ربانی ہے، ایک تحفہ ہے، اللہ کی طرف سے اس لیے کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الموت جسر يوصل الحبيب الى الحبيب (موت ایک پل ہے جو محبوب کو محبوب سے ملانے کے لیے ہے)۔

ازل سے ہی قدرت نے اجل کو کام سونپا ہے
چمن سے پھول چننا اور ویرانے میں رکھ دینا

یہ سلسلہ جاری ہے۔

----بقیہ صفحہ ۲۴ پر

بحرِ ادب کے عظیم شناور

ڈاکٹر محمد فرمان ندوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء)

مقبول و محبوب استاذ

ابھی دار العلوم ندوۃ العلماء کے مولانا ڈاکٹر نذیر احمد ندوی کے انتقال کے چند ہی دن ہوئے کہ سوشل میڈیا میں بہت سے مضامین و مقالات نشر کئے جا رہے ہیں، اور تعزیتی جلسے منعقد کئے جا رہے ہیں، یہ مضامین لکھنے والے مولانا مرحوم کے بڑے بھی ہیں، معاصرین بھی ہیں، اور خوردو شاگرد بھی ہیں، ان تمام مضامین میں قدر مشترک چیز یہ ہے کہ مولانا کا انتقال علمی و ادبی دنیا کا ایک بڑا سانحہ اور دل و دماغ کو متاثر کرنے والا واقعہ ہے، کہا جاتا ہے کہ زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھو، اور حدیث میں آیا ہے کہ أنتم شهداء الله على الأرض (صحیح بخاری) (تم زمین میں اللہ کے گواہ ہو)، اور امام احمد بن حنبلؒ کا مشہور جملہ ہے کہ: قولوا لأهل البدع: بيننا وبينكم الجنائز (بدعتیوں سے کہہ دو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان جنازے فیصلہ کریں گے)، مولانا نذیر احمد ندوی کے جنازہ کی نماز مجمع عام کی وجہ سے بڑے میدان میں ادا کی گئی، کیونکہ مجمع اتنا زیادہ تھا کہ مسجد کی دائیں سمت مہمان خانہ کے لان میں جہاں عام طور پر نماز جنازہ ہوتی ہے، اس کی گنجائش نہیں تھی، جب کہ انتقال اور جنازہ کے درمیان صرف چار پانچ گھنٹے کا فرق تھا، اس سے معلوم ہوا کہ مولانا کی شخصیت ہر خاص و عام میں بڑی مقبول ہے، سچ ہے کہ مولانا اپنے فن میں باکمال ہونے کے ساتھ ایک بے ضرر انسان تھے۔

جو اہل ظرف ہوتے ہیں ہمیشہ جھک کے ملتے ہیں
صراحی سرنگوں ہو کر بھرا کرتی ہے پیمانہ

تعمیر سیرت کے عوامل و محرکات

کسی بھی شخصیت کی تعمیر بنیادی طور پر ان عوامل و محرکات کی وجہ سے ہوتی ہے، جو اس کے پیچھے کار فرما ہوتے ہیں، مولانا کی سیرت و کردار میں وہ بنیادی افراد جن پر ان کی ذاتی اور علمی و ادبی زندگی کی عمارت قائم ہے، والدین ہیں، ان کی توجہ کے بعد اساتذہ دار العلوم کی خصوصی عنایت و شفقت ہے، اس سے بھی بڑھ کر ندوۃ العلماء کی علمی و روحانی فضا ہے، جہاں سوا سو سال سے قال اللہ و قال الرسول کے زمزمے بلند ہوتے ہیں، اور جس کے متعلق کہنے والے نے کہا ہے:

جو دل نہ کھنچے اس کی جانب بے سوز ہے وہ، بے ساز ہے وہ

اس ماحول میں انہوں نے پرورش پائی، جن اساتذہ نے ان کو سنوارا نکھارا، ان میں عناصر ثلاثہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، حضرت مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی، حضرۃ الاستاذ مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی ندوی قابل ذکر ہیں، جن سے مولانا نذیر احمد ندوی بہت مانوس تھے، انہوں نے ان کو ایسا نکھارا، سنوارا اور صیقل کیا کہ وہ آسمان علم کے نجم درخشاں اور نیز تاباں بن کر چمکے۔ ان کے علاوہ (۱) رسوخ فی العلم کی کوشش، (۲) مقصد کی دھن (۳) خشیت الٰہی (۴) صبر وضبط نے ان کی ذات کو مزید پرکشش اور مؤثر بنا دیا تھا۔

ذوقی موضوع

مولانا نذیر احمد ندوی نے اگرچہ دار العلوم ندوۃ العلماء میں حدیث شریف میں اختصاص کیا، لیکن ان کی پوری زندگی عربی زبان و ادب کی تدریس میں گذری، عربی زبان سے ان کو عشق کی حد تک لگاؤ تھا، انہوں نے عربی زبان کو اس لئے سیکھا اور سکھایا کہ وہ قرآن کی زبان ہے، رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان ہے، اور اہل جنت کی زبان ہے، اور یہی ان کا ذوق اور حال بن گیا تھا، مولانا عربی زبان کی تدریس میں ایسا انداز اختیار کرتے کہ مخاطبین اور طلباء ان کے درس کو پورے طور پر ہضم کر لیتے، الفاظ کی دلنشیں تشریح، اور ان کے فروق کی وضاحت، اردو محاوروں اور ضرب الامثال کا برمحل استعمال، کئی زبانوں میں الفاظ کے معنی کی وضاحت، اس پر مستزاد ان کا عربی لہجہ، انداز تکلم درس کو مؤثر بنا دیتا، اور طلباء ہمہ تن گوش ہو جاتے، انہوں نے اپنے ایک محبوب و مقبول استاذ مولانا برجیس احمد ندوی سے بہت زیادہ متاثر تھے، وہ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

”مولانا سے ذہنی مناسبت اور قلبی یگانگت تو زمانۂ طالب علمی ہی سے رہی تھی، لیکن رشتۂ تدریس میں منسلک ہونے کے بعد قربت اور یکجائی کے مواقع زیادہ میسر آئے، مولانا کو بارگاہ ایزدی سے آواز سامعہ نواز عطا ہوئی تھی، جو دامن دل کو اپنی جانب مائل کرتی تھی، اور ان کی پرسوز و پرکشش آواز کو سن کر بے ساختہ یہ شعر یاد آ جاتا تھا:

جان رگ رگ سے کھنچی آتی ہے کانوں کی طرف
کیا قیامت کی کشش اُف تری آواز میں ہے“

تحریری وتقریری سرمایہ

مولانا نذیر احمد ندوی کی عربی تحریروں کے نمونے تو الرائد کے صفحات پر بکھرے ہوئے ہیں، جن سے ان کی زبان شناسی وزبان دانی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، مولانا نے متعدد کتابوں پر مقدمے لکھے ہیں، جو عربی میں ہیں اور ان کی انشاء و عربی دانی کا نمونہ ہیں، مولانا کی عربی سے اردو ترجمہ کا ایک نمونہ ابھی جلد ہی شائع ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ ندوۃ العلماء کے ساتویں اجلاس منعقدہ عظیم آباد ۱۳۱۸ھ میں مولانا عبدالحمید صادق پوری نے ایک عربی نظم پیش کی تھی، وہ نظم اپنے مواد و معانی کے لحاظ سے اس لائق تھی کہ اس کا ترجمہ کیا جائے، یہ سعادت مولانا نذیر احمد ندوی کے حصہ میں آئی، اور انہوں نے بامحاورہ ترجمہ کیا۔ ذیل میں تین اشعار اور ان کے ترجمے پیش کئے جارہے ہیں:

لکم بشری وجاء کم الوفود
أتم مناکم الدهر العنود

(آپ کے لئے خوشی خبری ہے، اور آپ کے پاس وفود کی آمد ہوئی ہے، اس طرح سرکش، مشکل ترین، مخالف زمانہ نے آپ کی آرزو کی تکمیل کی ہے۔)

بحمد الله قد جاء ت رجال
من الأعلام هم نعم الوفود

بحمد اللہ ایسے معروف وممتاز مردان کار تشریف لائے ہیں جو بہترین وفد ہیں۔

کرام أتقياء أصفياء
يضيئ جباههم ليلا سجود

جو شرفاء، اہل تقوی اور اصحاب صدق وصفا ہیں، جن کی پیشانیاں بوقت شب سجدے سے روشن ہیں۔
(مثنوی وقصیدہ ص: ۴۸، مطبوعہ علامہ سید سلیمان ندوی تحقیقات اسلامی، لکھنؤ)

مولانا نذیر احمد ندوی نے دار العلوم ندوۃ العلماء میں عالمیت ۱۹۸۷ء میں کی، اور ۱۹۸۹ء میں تخصص فی الحدیث سے فارغ ہوئے، ان کے تخصص کے مقالہ کا عنوان تھا: أحادیث الفتن والملاحم، یہ مقالہ ڈھائی سو صفحات میں آج بھی کتب خانہ شبلی نعمانی کے شعبہ مقالات میں موجود ہے، مولانا نے لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ عربی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، اس کا موضوع بھی **أدب الفتن والملاحم في الحديث والنبوی الشريف**، گویا آپ نے تخصص فی الحدیث کے مقالہ کو دوبارہ مفصل انداز میں لکھا اور ۳۶۰ صفحات میں بڑے سائز میں یہ مقالہ جمع کیا گیا ہے، یہ مقالہ پروفیسر شبیر احمد ندوی سابق صدر شعبہ عربی لکھنؤ یونیورسٹی کی نگرانی میں لکھا گیا، مقالہ چار ابواب میں منقسم ہے، پہلا باب ادب اور اس کی حقیقت اور موضوع، تاریخ، علوم، اقسام وغیرہ پر مشتمل ہے، دوسرا باب: زمانہ نبوت کا عربی ادب، اس کی تفصیلات اس میں پائی جاتی ہیں یعنی رسول اکرم ﷺ کی ادبی خصوصیات، اصناف ادب، وغیرہ۔ تیسرا باب ادب عربی میں حدیث نبوی کی اثر انگیزی ہے، اس میں ادبی ناحیہ سے حدیث کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے، چوتھے باب میں فتن اور جنگ کی احادیث کا ادبی مطالعہ پیش کیا گیا ہے، جس میں عام فتنے، خاص فتنے اور قرب قیامت کی چھوٹی بڑی علامتوں کا تذکرہ مفصل اور محقق انداز میں ہے، یہ کتاب مقدمہ اور خاتمہ سے مزین ہے، اور فن اصول مقالہ نگاری سے متصف ہے، اس مقالہ کی تیاری میں ۱۱۶/ حوالے جات اور مراجع و مصادر کا تذکرہ ہے۔ واضح رہے کہ مقالہ نگار نے مقدمہ میں مولانا عبید اللہ فراہی سابق صدر شعبہ عربی لکھنؤ یونیورسٹی، اور مشرف مقالہ ڈاکٹر شبیر احمد ندوی کے علاوہ مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی اور مولانا محمد یعقوب ندوی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء کا خاص طور سے شکریہ ادا کیا ہے۔

مولانا نذیر احمد ندوی کے عربی خطابت کا انداز ان تقریروں سے ظاہر ہوتا ہے جو انہوں نے النادی العربی کے اسٹیج سے دار العلوم ندوۃ العلماء میں کئے، ادھر کلیۃ اللغۃ کے تحت رحلات ثقافیہ وعلمیہ کا سلسلہ شروع ہوا تو مولانا اس کے بنیادی افراد میں تھے، جن کے ذریعہ رحلات کے پروگراموں کو مرتب کرنے اور طلباء کو تیار کرنے میں مدد ملتی تھی، مولانا بذات خود ان میں شریک ہوتے تھے، اور متعدد پروگراموں کی صدارت بھی کرتے تھے، اور شستہ عربی میں خطاب بھی کرتے تھے۔ ابھی اسی سال **اللجنة الثقافية للنادی العربی بدار العلوم ندوة العلماء** کے تحت ان کا ایک قیمتی محاضرہ ۱۱/ ذی قعدہ ۱۴۴۷ھ ہوا، جس کا عنوان تھا: **النشاطات الثقافية و دورها في تنمية المهارات اللغوية** اس موضوع پر مولانا کا پر مغز خطاب ہوا، مولانا نے آدھے گھنٹے تسلسل سے عربی زبان میں خطاب کیا، اور اس کے بعد سوالات کے جوابات بھی دیئے، جس سے طلباء کو بے حد فائدہ پہنچا۔

مولانا نے ابھی چند سال پہلے صدائے دل کے نام سے ایک مجموعہ جو مولانا عبد الغفار ندوی نگرامی کے اشعار پر مشتمل ہے، مرتب کیا، اور اس میں ایک تفصیلی مقدمہ بھی لکھا ہے، واضح رہے کہ یہ اشعار منتشر اور بکھرے ہوئے تھے، لیکن مولانا کے حسن توجہ سے یہ مرتب ہوئے، اور مکتبہ ضیاء البدر مدح گنج کھدرا سے شائع ہوئے، اس کام کے پیچھے مولانا

کا وہی جذبہ احسان شناسی تھا کہ مولانا عبد الغفار ندوی (سابق استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء) مولانا نذیر احمد ندوی کے استاد تھے، جن سے انہوں نے نحو وصرف میں خاص طور پر استفادہ کیا تھا، اور ان کی زندگی میں ان کے ممنون رہے، انتقال کے بعد ان کے صاحبزادگان مولانا حسان ندوی، اور مولانا غیاث الدین ندوی سے بھی برابر تعلق رہا۔

افراد ساز شخصیت

غرض مولانا نذیر احمد ندوی ایک افراد ساز شخصیت تھے، ان کے ذریعہ ہزاروں طلباء بنے، سنوارے اور ان کو اپنی مستقبل کے سنوارنے میں بڑی مدد ملی، مولانا نذیر احمد صاحب سے طلباء درجے میں تو پڑھتے ہی تھے، خارجی اوقات میں ان سے استفادہ کا سلسلہ رہتا، کسی کو کمرہ میں، کسی کو مسجد میں، کسی کو راستہ چلتے یہ فیض پہونچاتے، میں نے خود دیکھا ہے کہ لوگ ان کو اپنی کتابوں کے مسودات دیتے اور وہ ان پر نظر ثانی کرتے، کئی پی ایچ ڈی کے مقالات کی تصحیح وترتیب میں ان کا غیر معمولی حصہ ہے۔ اس طرح انہوں نے پس پردہ رہ کر علم وادب کی خدمت کی اور افراد کو تیار کیا، مولانا نے دار العلوم میں کئی سال تک ہاسٹلوں میں طلباء کی نگرانی بھی کی، اور ان کی تربیت میں کوئی کمی نہیں کی، ہمہ وقت فکر مند رہا کرتے تھے، اور ان کی اصلاح وتربیت کے لئے نئے نئے اسالیب اور طریقے سوچا کرتے تھے، ان کی زیر نگرانی رہنے والے ایک طالب علم جو آج کل ینبوع سعودی عرب میں ہیں انہوں نے مولانا کے انداز نگرانی کے بارے میں بتایا تو سن حیرت بھی ہوئی، اور مسرت بھی، یہی وجہ ہے کہ طلباء نے بھی ان سے غیر معمولی محبت کا مظاہرہ کیا، اور دل کے نہاں خانہ میں جگہ دی ہے، اور صحیح معنوں میں مولانا نے اپنے حسن اخلاق، نرم گفتار اور مثالی سیرت وکردار سے دلوں کو فتح کر لیا۔ اور سچ کہا ہے کسی کہنے والے نے

ع جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتح زمانہ

آج بھی درجہ کے طلباء ان کے انداز تدریس، اور شفقت بھرے انداز کو یاد کر کے اپنی عقیدت ومحبت کا نذرانہ پیش کر رہے ہیں، اللہ تعالی ان کو غریق رحمت فرمائے، ان کی حسنات کو ان کے رفع درجات کا ذریعہ بنائے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

❁❁❁

---بقیہ صفحہ ۲۱/کا

بہر کیف جناب مولانا ڈاکٹر نذیر احمد ندوی صاحب ہم میں نہیں؛ لیکن اپنے رب کے حضور میں پہنچ گئے ہیں اور جہاں ان کی پذیرائی ہو رہی ہوگی، اس لیے کہ انہوں نے وہ قربانی دی ہے، پوری زندگی اس مادر علمی کے لیے، اور قربانی جب ملتی ہے تو اس سے کہیں زیادہ اللہ تعالیٰ عطا فرماتے ہیں، حضرت سلیمان علی نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ایک نماز چھوٹ گئی تھی۔

عزیزو! غور سے سننا، کتنوں کی نمازیں چھوٹتی ہیں، جماعتیں چھوٹتی ہیں اور کتنے ایسے ہیں جو نماز کے تعلق سے لاپرواہ ہوتے ہیں۔

حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب نے لکھا ہے کہ اللہ رب العزت حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جو تخت رواں دیا تھا، یہ کس صلہ میں دیا تھا، لکھا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی ایک نماز چھوٹ گئی تھی، اپنے گھوڑوں کی دیکھ بھال میں، لہٰذا اتنا تاثر ہوا کہ جتنے گھوڑے ان کے ذاتی تھے، ان سب کو انہوں نے ذبح کیا اور ان کو تقسیم کر دیا، ان کے شریعت میں گھوڑے حلال تھے، اللہ تبارک وتعالیٰ کو یہ ادا اتنی پسند آئی، اپنی سواریوں کو انہوں نے اللہ کی رضا کے لیے قربان کیا ہے، تو اللہ نے ہواؤں کو ان کے تابع کر دیا اور تخت رواں عطا فرمایا کہ: "غدوها شهر ورواحها شهر" صبح جب نکلتے تھے تو ایک مہینہ کی مسافت شام جب نکلتے تھے تو ایک مہینہ کی مسافت، آج دنیا کے اندر بڑا سے بڑا جہاز جو بہت زیادہ تیز چلنے والا ہو، وہ بھی ایک مہینے کی مسافت، صبح سے شام طے نہیں کر پاتا ہے، اللہ نے یہ چیز دی تو مفتی شفیع صاحب نے لکھا ہے، یہ اس قربانی کا صلہ ہے جو ایک نماز کے چھوٹنے پر ان کو اثر ہوا تھا تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہواؤں کو ان کے تابع کر دیا۔ لوگو! جس نے ساری زندگی قربانی دی تو اس کا کیا پوچھنا ہے، ہم تو یہی بات عرض کرتے ہیں اور آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ نماز کی فکر کرو، جماعت کی فکر کرو، جہاں بھی رہو تڑپتے رہو، ایک بھی نماز چھوٹنے پر یہ تڑپ پیدا ہو جائے تو اللہ اتنا نوازتا ہے اور تمہاری یہ نماز چھوٹتی رہے، کمروں میں سوتے رہو، فکر نہ کرو، بازاروں میں گھومتے رہو، یاد رکھو! یہ قربانی نہیں ہے؛ بلکہ اپنے آپ سے اپنی زندگی سے کھلواڑ ہے، اس میں تمہیں شیطان لگا رکھا ہے، خدا ہم سب کو توفیق سے نوازے اور مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے، کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے اور ان کی پذیرائی اس طرح ہو: **فادخلي في عبادي وادخلي جنتي** ۔

❁❁❁

علم وفضل کا روشن چراغ

مولانا محمد ناصر ندوی (پرتاپ گڑھ)

ندوۃ العلماء لکھنؤ کی فضاؤں میں علم، اخلاق، اور روحانیت کی خوشبو صدیوں سے رچی بسی ہے۔ انہی فضاؤں میں ایک ایسا چراغ روشن ہوا تھا جس کی روشنی نے نہ جانے کتنے ذہنوں کو منور کیا اور کتنے دلوں کو گرما دیا، وہ چراغ تھے مولانا ڈاکٹر نذیر احمد ندویؒ۔ ان کی ناگہانی رحلت نے ندوہ کی علمی و ادبی دنیا کو غمزدہ کر دیا، وہ مسکراتا چہرہ، وہ شائستہ گفتگو، اور وہ وقار و انکسار کا پیکر اب ہمارے درمیان نہیں رہا۔

مولانا مرحوم کی پیدائش ۱۹۶۵ء میں ہوئی، آپ کا تعلق ضلع اٹاوہ (اتر پردیش) سے تھا۔ ندوۃ العلماء ہی آپ کی تعلیم وتربیت کا مرکز رہا، یہیں سے فیض پایا، اور یہی مرکز بعد میں آپ کی خدمت وتدریس کا میدان بنا۔ وہ ندوہ کے ان خوش نصیب فرزندوں میں سے تھے جنھوں نے اپنے استادوں کے علم و وقار، اور اخلاق کی وراثت کو نہ صرف محفوظ رکھا بلکہ اس میں اپنی خلوص وخاموشی کی چمک بھی شامل کر دی۔

ڈاکٹر نذیر احمد ندویؒ کا شمار ان اساتذہ میں ہوتا تھا جن کی موجودگی خود ایک درس ہوتی تھی، وہ علم کے ساتھ حلم، اور تدریس کے ساتھ تربیت کا امتزاج رکھتے تھے۔ ان کی شخصیت میں ایک عجیب توازن تھا، سنجیدگی میں نرمی، وقار میں محبت، اور علم میں تواضع۔ وہ کبھی نمایاں ہونے کی کوشش نہیں کرتے تھے، لیکن ان کا علمی وقار خود انہیں نمایاں کر دیتا تھا۔ وہ عربی زبان وادب کے ماہر تھے، مگر ان کا وسعتِ مطالعہ اور زبان دانی عربی سے کہیں آگے تک پھیلی ہوئی تھی۔ اردو، فارسی، ہندی، اور انگریزی زبانوں پر قدرت رکھتے تھے، ترجمے میں سلاست، اسلوب میں دل آویزی، اور عبارت میں شگفتگی ان کی تحریر کی پہچان تھی۔

مولانا مرحوم کو طلبہ کی تعلیم وتربیت سے بڑا لگاؤ تھا، وہ طلبہ میں صلاحیت پیدا کرنے کی فکر میں رہتے تھے، اور بڑی ذمہ داری سے تدریس کا فریضہ انجام دیا کرتے تھے، ابھی کچھ مہینے پہلے طبیعت خراب ہوئی، ہاسپٹل میں ایڈمٹ کیے گئے، مگر صبح تعلیم کے وقت اسپتال سے چھٹی لے کر ندوہ آتے اور طلبہ کو پڑھا کر واپس ایڈمٹ ہو جاتے۔

آپ کی تدریس کا انداز پرکشش تھا، جو فن بھی پڑھاتے تھے، اس کا حق ادا کرتے تھے، اور طلبہ میں اس فن سے مناسبت پیدا کر دیتے تھے، ادب عربی ان کا خاص موضوع تھا، وہ عبارتوں کی ایسی تشریح کرتے تھے کہ طلبہ کے دلوں میں جاگزیں ہو جاتی تھی، اور علم کو عمل سے جوڑنے کی ترغیب دیتے۔ فرمایا کرتے: ''علم اگر کردار نہ بنے تو وہ محض الفاظ کی مشق ہے''۔ وہ ہر سبق کو اخلاقی تربیت سے مربوط کرتے، اور اپنے شاگردوں کو احساس دلاتے کہ عالم ہونا دراصل ایک اہم ذمہ داری ہے۔

مولانا نذیر احمد ندویؒ کی شخصیت کی سب سے نمایاں خوبی ان کا انکسار تھا، ان کے چہرے پر اطمینان، گفتار میں نرمی، اور برتاؤ میں خلوص کی جھلک نمایاں تھی۔ وہ کسی سے بلند لہجے میں بات نہیں کرتے تھے، نہ کسی پر اپنی علمیت کا بوجھ ڈالتے۔ ان سے ملاقات ایک قلبی سکون عطا کرتی، گویا ان کے پاس بیٹھنا بھی تربیت کا ایک حصہ ہو۔

میرے طالبِ علمی کے زمانے میں مولانا ندوے میں استاد تھے، اور ''الرائد'' میں مستقل آرٹیکل لکھتے تھے، مولانا سید محمد واضح حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی خصوصی توجہ انہیں حاصل تھی، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا اعتماد حاصل تھا، وہ اکثر کتابوں کی بڑی عرق ریزی سے پروف ریڈنگ کرتے تھے، اپنی محنت شاقہ سے وہ بہت کم وقت میں مولانا محمد واضح حسنی ندویؒ کے قلم کے پرتو بن گئے تھے، خود کو اس قدر گھپایا کہ ''الرائد'' کے ذمہ داروں کو مولانا نذیر احمد ندوی پر مکمل اعتماد ہو گیا تھا، اور تمام تحریریں ان کی نظر سے گزر کر ہی ''الرائد'' میں شامل ہوتی تھیں۔

مولانا مرحوم کی ایک نمایاں خوبی یہ تھی کہ وہ خودنمائی سے بہت دور تھے۔ تکبر یا شہرت پسندی سے ان کا سرے سے کوئی تعلق نہ تھا، وہ کام کرتے تھے مگر چرچہ پسند نہیں کرتے تھے۔ علم کو عبادت سمجھ کر پڑھاتے، اور شاگردوں کو اخلاص وللّٰہیت کی تعلیم دیتے تھے، خدا آگاہ تھے، ان کی زبان ذکر الٰہی میں مشغول رہتی تھی، اگر کسی ادارے کو مولانا نذیر صاحب مرحوم جیسے چند اساتذہ میسر آجائیں تو ادارہ بے نظیر بن سکتا ہے۔

-----بقیہ صفحہ ۲۹/ پر

نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

ڈاکٹر محمد اعظم ندوی (استاذ المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد)

استاذ مکرم کی رحلت کی خبر بجلی بن کر گری ؏

خوش درخشید ولے شعلہ مستعجل بود

ایسا لگا جیسے اہلِ علم کے افق سے ایک اور ستارہ ٹوٹ کر گرا ہو، اور علمی فضا میں ایک گہری اداسی چھا گئی ہو، وہ ایک ایسے کامیاب استاذ تھے جن کے درس میں شریک ہونا صرف عبارتوں کا حل کرنا نہیں، بلکہ علم وادب کا لطف اٹھانا ہوتا تھا، وہ بات کرتے تو الفاظ پھول بن جاتے، جملے خوشبو بن کر فضا میں بکھر جاتے، ان کی گفتگو میں ایسا رس اور بانکپن تھا کہ سننے والا دیر تک اس کے سحر میں گرفتار رہتا ؏

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

ان کی تدریس کا انداز دل کو موہ لینے والا تھا، عربی زبان وادب تو تھا ہی ان کا میدان، جس کے وہ شہ سوار تھے، ندوہ کے پندرہ روزہ عربی ترجمان "الرائد" کی مجلس مشاورت کے رکن رکین بھی تھے، اور اس میں گاہے گاہے ان کے مضامین وتراجم شائع ہوتے تھے، اردو شعر وسخن سے بھی مولانا کو حظ وافر ملا تھا، انگریزی پر بھی غیر معمولی قدرت رکھتے تھے، عربی عبارتیں پڑھاتے تو گویا لفظوں کی گرہیں کھلتی جاتیں، اور اردو میں اس کا ترجمہ کرتے تو جملے میں ایسا ذوق، ایسی سلاست اور ایسی چاشنی گھول دیتے کہ دل جھوم اٹھتا، میں نے ان سے **مختارات ثانی** اور **مجموعة من النظم** پڑھی تھی، وہ جب کسی نثری یا شعری فن پارے کی اردو تعبیر کرتے تو معنی کا دریا بہا دیتے، ایک بار انہوں نے "يَتَلَألَأُ وجهه تَلَألُؤَ القمر ليلة البدر" کا ترجمہ یوں کیا: "آپ کا رخِ روشن ماہِ شبِ چہار دہم کی طرح چمکتا تھا"۔

یہ جملہ اب بھی میرے دل کے نہاں خانوں میں پنہاں ہے، اور یاد آتے ہی ایک روح پرور روشنی ذہن میں پھیل جاتی ہے، ان کے ترجمے محض لفظ کی جگہ لفظ کے نمونے نہیں ہوتے تھے، وہ اعلی لسانی مذاق کا مظہر ہوتے تھے، میں ان کی درسی تقریروں کے ہر فقرے کو نوٹ کرتا، پھر عبارتوں پر دھیان دیتا، مگر چند جملوں کے بعد وہ کوئی ایسی خوبصورت تعبیر لے آتے کہ قلم خود بخود رکنے سے انکار کر دیتا، میں عش عش کر اٹھتا، اور پھر قلم بند کرتا، معلوم نہیں برقی دور میں وہ قلمی یادداشتیں غریب الوطنی کی کس گرد میں چھپی ہوں گی، ہاں اب تک یاد ہے کہ ان کا انداز ہر ہر فقرہ کو درد واثر سے بھر دیتا تھا، بس سامنے ایک درسی کتاب رکھنے کی دیر تھی ؎

پھر دیکھیے انداز گل افشانئ گفتار

رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

مولانا کے بعض ادبی تبصرے بھی یاد آتے ہیں، ایک بار کہنے لگے: "امیر جمع ہیں احباب درد دل کہہ لے" میں جمع کے میم کو ساکن پڑھا جائے تو وزن کی زیادہ رعایت ہو، اور شعری ضرورت کی وجہ سے گوارا بھی۔

ایک بار فرمایا: بڑے لوگوں کی بعض تسامحات بھی ادبی شاہکاروں میں شمار ہوتی ہیں، مثلا مولانا آزاد کا یہ جملہ کہ "ہم خاک نشینان بوریائے مذلت" یا تو خاک نشیں ہوں گے یا بوریا نشیں، یا غالب کا یہ مصرع کہ: "ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا" میں پا اور پا دو بار آنا تنافر وتعقید سے خالی نہیں، اس لیے بولنے میں ثقیل ہیں، لیکن آزاد اور غالب پر حرف رکھے، کس کی جرات!

مولانا فرمایا کرتے تھے کہ قرآنی ادب کے ساتھ ساتھ حدیث وفقہ کے ادب کا مطالعہ بھی نہایت ضروری ہے، خصوصاً ہدایہ کی روشنی میں، جہاں ایسی لطیف تعبیرات ملتی ہیں جیسے **استرخاء المفاصل، أين بانت يده** اور **يعالج بالأصبع** وغیرہ۔

ڈاکٹر نذیر احمد ندویؒ کی شخصیت میں وقار، نرم گفتاری، حلم وعلم، اور حسنِ ادا کا ایسا امتزاج تھا جو کم ہی دیکھنے میں آتا ہے، ان کے اندازِ گفتگو میں تاثیر تھی، ان کے اسلوبِ تدریس میں حسن تھا، ان کے سکوت میں بھی علم بولتا تھا، ان کی نشست و برخاست، شیروانی، عینک یہاں تک کے پانی پینے کا انداز بھی پسند کیا جاتا تھا، ایسی نفاست، ایسی صوتی حلاوت، ایسا سلیقہ، ایسی متانت، شگفتگی اور معصومیت کہ انسان فدا ہو جائے، اور ان سے نظر ہٹنے نہ پائے، ہم نگاہیں چرا کر بھی ان کی لب کشائی سے محظوظ ہوتے تھے، اور دیر تک کتابی دنیا سے دور ہو جاتے تھے ؎

رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں

ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے

مولانا ایک بلند نگاہ، شریف النفس، بے تعصب، بے نیاز، نیک سرشت اور خوش خصال وباکمال انسان تھے، بے نفس اور بے ضرر، جلب زر اور دار و در کے ہنر سے بھی ناواقف معلوم ہوتے تھے، کسی پر اپنے علمی تفوق وبرتری ---

-----بقیہ صفحہ ۲۹/پر

کچھ سخنور تھے کہ سحر اپنا دکھا کر چل دیے

محمد ارمغان بدایونی ندوی (دارِ عرفات تکیہ کلاں، رائے بریلی)

چمنستان ندوہ میں علم وادب اور فکر وفن کے جتنے بھی حسین پھول کھلے اوران کی خوشبو نے مشام جان کو معطر کیا، یقینا ان میں ایک نمایاں نام مولانا ڈاکٹر نذیر احمد ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہوگا جن کی کشت فکر سے ایک عالم سبزہ وار ہوا۔ وہ اسلامی مزاج کے حامل، صالح ندوی فکر کے ترجمان اور ندوہ کے ایک خاموش خادم تھے، ان کی حیثیت سب سے جدا اور سب کے رفیق کی تھی، وہ بڑے متین وحلیم، نفاست پسند اور طبعاً کم سخن واقع ہوئے تھے، تقویٰ ودین داری اور تواضع وانکسار ان کے چہرۂ کمال کا خط وخال تھی، درس وتدریس اور طلبہ کی علمی رہنمائی ان کا سب سے محبوب شغل تھا۔

مولانا مرحوم نے ظاہر وباطن میں مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ سے کسب فیض کیا، ان کی رہنمائی میں اپنا علمی سفر جاری رکھا اور انہی کے ایما پر ندوہ میں مسند تدریس پر بھی جلوہ آرا ہوئے، انہیں اپنی سعادت مندی اور ذاتی خوبیوں کی بنیاد پر حضرت مولانا کا اعتماد بھی حاصل تھا، اسی لیے انہیں حضرت مولانا کے ذاتی خطوط کا ترجمہ کرنے اور علمی کاموں میں معاون بننے کا شرف بھی حاصل رہا ہے۔ حضرت مولاناؒ کی وفات کے بعد وہ مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کے دامن عقیدت سے وابستہ ہوئے اور عشق ومحبت کی منزلیں طے کرتے ہوئے بخوبی سرگرم سفر رہے۔ فکر اسلامی کے نقیب حضرت مولانا واضح رشید حسنی ندویؒ سے انہیں خاص تعلق تھا اور مزاج و مذاق کی ہم آہنگی کے سبب نسبتاً استفادہ کے مواقع انہی سے زیادہ میسر ہوئے۔

مولانا مرحوم کو بیک وقت عربی‘ اردو اور انگریزی تینوں زبانوں پر یکساں عبور حاصل تھا، خاص طور پر وہ عربی زبان کے ذوق ہی نہیں بلکہ ذائقہ شناس تھے، تاریخ ادب عربی پر ان کی گہری نگاہ تھی، عربی زبان میں داخل ہونے والے نئے الفاظ، ان کے معانی ومفاہیم، ان کا برمحل استعمال اور اس راہ کی تمام نزاکتوں پر انہیں بڑی گرفت حاصل تھی، عربی ادباء وشعراء کے کلام پر فنی مباحث گویا انہیں حفظ تھے۔ ندوہ کا مشہور مجلہ پندرہ روزہ ”الرائد“ ان کی عربی زباں دانی کا شاہد ہے، مولانا مرحوم کی صحت وطبیعت نے جب تک ساتھ دیا‘ تب تک وہ پوری تندہی کے ساتھ اس کی خدمت میں مصروفِ عمل رہے۔ صحت کے عوارض لاحق ہونے کے بعد بھی وہ خالی اوقات میں الرائد کی پروف ریڈنگ ہی کو ترجیح دیتے اور بڑے ذوق وشوق سے تصحیح فرماتے۔

مولانا کا ذوق تدریس انتہائی منفرد تھا، نرم لہجہ اور نرم خوئی طلبہ کو ان کا گرویدہ بنالیتی، ان کی علمی پختگی طلبہ کے علمی اعتماد میں اضافہ کا باعث ہوتی، جب وہ انشاء پڑھاتے تو اسے ایسا سہل بنا کر پیش کرتے کہ مشکل سے مشکل جملے بھی بنانا آسان ہوں، زیادہ تر وہ ایسے الفاظ طلبہ کو زبان زد کرانے کی کوشش کرتے جو کم از کم ان کے لیے نئے ہوں، اثنائے درس وہ ان محاورات اور تعبیرات کا استعمال کرتے تھے جن کا تعلق دین ودنیا دونوں سے ہوتا۔ ان کے درس میں بیٹھنے والا طالب علم کبھی بھی جمود یا غفلت کا شکار نہیں ہوتا، بلکہ وہ اپنی دھیمی اور شیریں آواز سے ایک ایسے علمی آبشار کا تسلسل بنائے رکھتے جس سے ہر ایک کی دلچسپی برقرار رہے۔ شمائل ترمذی کا باب بھی آپ کے زیر درس تھا، حدیث کا یہ حصہ ادبی لحاظ سے بھی خاصی اہمیت کا حامل ہے، مولانا جب یہ مضمون پڑھاتے تب بھی طلبہ ہمہ تن گوش ہوجاتے اور ان کی علمی‘فنی‘ ادبی اور عشق رسولؐ میں سرشار گفتگو سے خوب محظوظ ہوتے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں زبان وبیان کی صلاحیت سے بھی خوب نوازا تھا، گو کہ وہ کوئی فنی یا رسمی مقرر نہ تھے، تاہم ان کی گفتگو بڑی مرتب ومدلل، حقائق پر مبنی اور دلوں کو موہ لینے والی ہوتی تھی، ماہِ رمضان کی تعطیلات کے موقع پر عموماً وہ بنگلور چلے جاتے اور وہاں کی خوش گوار فضا میں قیام پسند کرتے، اس موقع پر مختلف مساجد ومراکز میں ان کے پر مغز خطابات ہوتے، دروس قرآن کے حلقے لگتے اور علمی وادبی محفلیں بھی سجتیں۔

مولانا کا عربی اسلوبِ نگارش تو اب اس دور میں عنقا نظر آتا ہے، بلاشبہ وہ ایک صاحب طرز ادیب تھے، ان کے عربی مضامین ایک کہنہ مشق ادیب ہونے کا پتہ دیتے ہیں، بعض اوقات وہ آسان اور سادہ جملوں کو بھی اس طرح حیطہ تحریر میں لاتے تھے کہ قارئین انگشت بدنداں رہ جائیں، داعی اسلام حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ کی وفات کے موقع پر ان کے مضمون کی یہ شہ سرخی آج بھی یاد ہے: ”هزار غنّی ثم هوی“

مولانا کی زندگی کا اصل جوہر ان کا زہد و استغنا، سادگی و بے نفسی، اولوالعزمانہ اخلاق اور صبر و تحمل تھا۔ ان کی زندگی اس شعر کا مصداق تھی ع

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پرواہ

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں جن خداداد صلاحیتوں سے نوازا تھا، اگر وہ چاہتے تو یقیناً عصری دانش گاہوں میں ان کی بنا پر دام وصول سکتے تھے، مگر ان کا فقر اختیاری اور مال وجاہ سے بے رغبتی کی علامت تھا، انہوں نے انتہائی بساطت کے ساتھ اپنی پوری عمر ندوہ کے ایک چھوٹے سے حجرہ میں رہنا پسند کیا، انہیں کبھی یہ زعم نہ ہوا کہ وہ ندوہ کے ایک مؤقر ادیب ہیں، وہ اپنا ہر بڑا اور چھوٹا کام خود ہی کرتے، ان کا نظام ہضم بڑا متاثر تھا اور وہ مطبخ کا کھانا کھانے سے معذور تھے، مگر کبھی ایسا نہ ہوا کہ انہوں نے کسی طالب علم کو کھانا تیار کرنے کی زحمت دی ہو، بلکہ وہ خود ہی بازار سے اپنا سامان لاتے، خود ہی اس کو کاٹتے اور بناتے اور کھانے کے بعد خود ہی اپنے برتن بھی دھو لیتے، تعجب کی بات یہ تھی کہ یہ سب کام وہ اس قدر خاموشی سے کرتے کہ ان کے قریب رہنے والے طلبہ کو بھی پتہ ہی نہیں لگتا کہ ان کا معمول کیا ہے؟

اس گنہگار کو ان کے بعض اسفار میں معیت کا موقع ملا، دوران سفر بھی ان کی سادہ مزاجی کے یہی نقوش مزید ابھر کر سامنے آئے، وہ پروٹوکول اور ہٹو بچو کی دنیا سے بالکل الگ تھے، عام سواریوں اور جنرل کلاس میں بھی سفر کے عادی تھے، انہیں کہیں بھی شہ نشیں پر جلوہ افروز ہونے کا شوق نہ تھا، ان سے جہاں جانے کی درخواست کی جاتی وہ بلاتکلف چلے جاتے، انہیں جہاں لیٹنے کی جگہ مل جاتی وہ بلاتردد وہیں استراحت کے لیے آمادہ ہو جاتے، سفر کے دوران انہیں خود سے زیادہ اپنے خوردوں کے آرام وراحت کی فکر رہتی۔ یہ بھی ان کی ایک اچھی خوبی تھی کہ وہ جس جگہ کا سفر کرتے تو وہاں کے لوگوں کو کبھی نہ بھولتے بلکہ انہیں ہمیشہ یاد رکھتے اور گاہے گاہے ٹیلی فون پر ان کی خیریت بھی دریافت کرتے رہتے۔

آثار قدیمہ اور تاریخی مقامات سے انہیں خاص دلچسپی تھی، نایاب اور نادر چیزوں کی حفاظت کا انہیں بڑا شوق تھا، اخبار کے اہم اور تاریخی تراشے ان کی فائل میں سجے ہوتے، قدیم زمانہ کے سکوں کو خوبصورتی سے اپنے پاس رکھتے، یادگار چیزوں کو جمع کرنے کا سلیقہ بھی خوب تھا۔ ۱۲/ دسمبر ۲۰۱۲ء کی تاریخ تھی، دوپہر کا وقت تھا اور یہ گنہگار ان کی خدمت میں حاضر تھا، کہنے لگے آج کا دن اس لحاظ سے اہم ہے کہ یہ بارہویں مہینے کی بارہویں تاریخ ہے اور یہ سن بھی بارہواں ہی ہے، پھر فرمایا کہ گذشتہ سالوں میں جب کوئی ایسا دن آیا جس میں تاریخ، مہینہ اور سال کی یکسانیت رہی ہو اور اس دن ہمیں ٹرین کے سفر کا اتفاق ہوا ہو تو ہم نے اس ٹکٹ کو بڑے اہتمام سے رکھا ہے تا کہ وہ ایک حسین یادگار کے طور پر ہمارے پاس رہے۔

مولانا ایک زمانہ تک ندوہ میں رواق اطہر کی بالائی منزل کے نگراں تھے، جن طلبہ کو ان کی زیر نگرانی رہنے کا موقع ملا ہے وہ جانتے ہیں کہ مولانا کس قدر نرم مزاج اور نیک طبیعت کے مالک تھے، نگرانوں میں یہ نصیب کم ہی حضرات کا ہوتا ہے کہ طلبہ ان کی شرافت نفسی کی رعایت میں شرارت سے باز رہیں، مولانا مرحوم بھی حقیقت میں ان ہی نصیبہ وروں میں تھے، ان کی زیر نگرانی رہنے والے طلبہ تعلیمی اوقات میں ہاسٹل آنے سے احتیاط کرتے، نماز کے اوقات میں از خود مسجد جانے کا اہتمام کرتے اور دار العلوم کے قواعد وضوابط کی بھرپور پابندی کرتے تھے، جب کہ فی نفسہ مولانا مرحوم کا طلبہ پر ایسا کوئی زور دباؤ یا تلخ رویہ ہرگز نہیں تھا، لیکن مولانا کی نیکی کا تقاضا یہی تھا کہ طلبہ ان کی نرمی سے ناجائز فائدہ نہ اٹھاتے۔

زمانہ طالب علمی میں جب مولانا کی زیر نگرانی رہنے کا موقع ملا تو بے شمار مواقع پر ان کی ذرہ نوازیوں کے اچھوتے انداز دیکھنے میں آئے اور خاص طور پر ان کی بعض ادائیں کبھی بھلائی نہیں جاسکتیں، عموماً امتحانات کے زمانہ میں جب ہم رفقاء پوری لگن کے ساتھ پڑھائی میں مصروف ہوتے، تو اچانک مولانا دروازہ کے پاس لبوں پر مسکراہٹ بکھیرے نظر آتے اور اپنے ساتھ کمرہ میں لے جاتے، وہاں جا کر کیا دیکھتے ہیں کہ ہر ایک کے حصے کی چائے کا کپ دسترخوان پر رکھا ہوا ہے، جب ہم محو حیرت ہو کر مولانا کو دیکھتے تو فرماتے کہ اس کو پی لو تا کہ مزید بشاشت کے ساتھ پڑھائی کر سکو، صرف یہی نہیں بلکہ، ہم رفقاء اس وقت مزید سراپا ندامت بن جاتے جب ہم میں سے کوئی چائے کی پیالیاں دھلنے کے لیے لپکتا، یہ بات ان کی طبع نازک پر بڑی گراں گزرتی اور وہ کہتے کہ تمہارا محنت سے پڑھنا ہی ہمارے لیے سب کچھ ہے۔ یقیناً ایسے غیر معمولی اخلاق کریمانہ اور یہ عاجزی اب کہاں میسر ہے ؎

وے صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے انکھیاں ترستیاں ہیں

مولانا مرحوم میں افراد شناسی کا جوہر بھی خوب تھا، جو طلبہ ان سے اپنے مستقبل کے متعلق مشورہ کرتے تو وہ انہیں بڑے مفید مشوروں سے

نوازتے، کسی کو عربی میدان سے وابستگی کے طریقے بتاتے، کسی کو تدریسی صلاحیتوں پر توجہ دینے کی نصیحت کرتے، کسی کو تقریری میدان اپنانے کا مشورہ دیتے، کسی کو تحقیقی و تصنیفی لائن میں جانے کی ہدایت کرتے اور بعض طلبہ کے مزاج و مذاق کو دیکھتے ہوئے عصری علوم حاصل کرنے کی طرف بھی رہنمائی کرتے۔

ادھر چند سالوں سے ان کی صحت روز بروز گرتی جا رہی تھی، پیٹ کے وہ پرانے مریض تھے، اس کے علاوہ دل کے امراض سے بھی دوچار تھے، وہ اپنی صحت کو لے کر خاصے فکر مند رہتے تھے، فجر کی نماز کے بعد اپنے اذکار کے ساتھ بڑی پابندی سے ورزش بھی کرتے، کئی کئی کلومیٹر تک پیدل چلتے، اکثر و بیشتر ایسا ہوتا کہ چار باغ ریلوے اسٹیشن سے اتر کر ندوہ تک پیدل ہی آجاتے، آخری دنوں میں یہ بات بھی دیکھنے میں آئی کہ وہ عموماً ایسی جگہ کی تلاش میں رہتے جہاں لوگوں کا ہجوم نہ ہو اور آمد و رفت کا سلسلہ بھی منقطع ہوتا کہ وہ یکسوئی کے ساتھ سکون وچین کے چند لمحات بسر کرسکیں۔ خدا کی مرضی کہ اب اس نے اپنے اس باہمہ و بے ہمہ بندے کو ایسی جگہ بلالیا جہاں لامتناہی عیش وآرام اور سکون واطمینان ہے، وہاں یقینا انہیں {لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ} کا مژدہ سنایا گیا ہوگا۔ بلاشبہ ان کی ناگہانی وفات سے دنیائے علم وادب میں مدتوں ایک خلا محسوس کیا جاتا رہے گا، تاہم وہ اپنے رب کے حضور اپنی زندگی بھر کی تگ ودو کا انعام حاصل کرنے جاچکے۔

”خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را“

❁❁❁

-----بقیہ صفحہ ۲۵/ کا

مولانا نذیر احمد ندویؒ کا تعلق حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے بھی نہایت گہرا تھا۔ حضرت مولانا کے فیضانِ علم وتربیت نے ان کی شخصیت پر نمایاں اثر ڈالا۔ مولانا نذیر ندوی مرحوم حضرت مولانا کی تحریروں اور خطابات سے گہرا شغف رکھتے تھے، ان کے فکری انداز اور اسلوبِ دعوت کے دل سے قائل تھے۔ ندوہ کی فکری فضا میں حضرت مولانا علی میاںؒ کی روحانی تاثیر اُن کے اندر بھی جھلکتی تھی۔

ڈاکٹر نذیر احمد ندوی کی وفات اچانک ہوئی۔ بتایا جاتا ہے کہ ۷ اکتوبر کی صبح کو حسبِ معمول درس دیا، اور کچھ دیر بعد دل کا دورہ لاحق ہوا، اچانک چند لمحوں میں وہ اس دارِ فانی سے رخصت ہوگئے۔

افسوس کہ ۱۹۶۵ء میں طلوع ہونے والا آفتابِ دوپہر ڈھلنے سے پہلے غروب ہوگیا، ان کی آخری سانس بھی علم وخدمتِ دین کے ماحول میں گزری۔ یہی ان کی زندگی کی اصل تصویر تھی۔ خاموش خدمت، مسلسل محنت، اور علم کے لئے زندگی وقف کردی تھی۔ ان کی وفات نے ندوہ کے علمی حلقے میں ایک ایسا خلا چھوڑا ہے جو بظاہر برسوں پُر نہ ہوسکے گا۔ وہ صرف ایک استاذ نہیں، ایک انجمن تھے۔ ان کے جانے سے ندوہ کی فضا سوگوار ہے، مگر ان کی یادیں، ان کی دعائیں، ان کی مردم گری اور ان کی بے لوث خدمات دیر تک طلبہ کے دلوں میں زندہ رہیں گی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مولانا مرحوم کو اپنی جوارِ رحمت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، ان کے درجات بلند کرے، اور ان کے فیوض وبرکات کو باقی رکھے۔

❁❁❁

-----بقیہ صفحہ ۲۶/ کا

اور ہمہ دانی کا اظہار نہیں کرتے تھے، اللہ کے برگزیدہ بندوں میں تھے، ان کے بارے میں زبان خلق پر یہی شہادت ہے، اور اس پر ”وجبت له الجنة“ کا وعدہ بھی ہے: أنتم شهداء الله في الأرض۔

گذشتہ سال ندوہ میں فقہی سیمینار کے موقع پر ان کے ساتھ ناشتہ کی میز پر کچھ دیر بیٹھنے کی سعادت ملی تھی، ہمیں ان کی منکسر المزاجی سے حیا آرہی تھی، محسوس ہوا کہ مولانا کو امراض نے گھیر رکھا ہے؛ اس لیے بڑی احتیاط سے کھانا پڑ رہا ہے، شوگر حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی، مولانا پر ہجوم رنج والم کے آثار دیکھ کر صدمہ ہو رہا تھا، اب مولانا پہلے کے سے زندہ دل، شگفتہ مزاج اور خوش طبع نظر نہیں آرہے تھے، لیکن وہ نقش دیوار نہیں بنے، اور گوشۂ عافیت میں نہیں بیٹھے، دم واپسیں تک درس دیتے رہے، سن کر تحیر آمیز رشک آیا کہ مولانا نے ۷/ اکتوبر بروز منگل کی صبح بھی دو گھنٹے پڑھائے، اور ”مریں گے ہم کتابوں پر“ کا وعدہ سچ کردکھایا۔

آج ان کے جانے سے نہ صرف ان کے شاگرد، بلکہ پورا علمی حلقہ ایک بڑے عالم دین، نفیس ونستعلیق مدرس، اور عربی کے صحافی وادیب سے محروم ہوگیا ہے، وہ صرف استاذ نہیں، علم کی خوشبو تھے؛ اب وہ خوشبو فضا میں بکھر گئی ہے، مگر ان کی علمی یادوں اور ان کے ادبی جملوں سے ہمیشہ دل کی دنیا مہکتی رہے گی ؂

عمر کے ہر ورق پہ دل کی نظر
تیری مہر ووفا کے باب آئے
کر رہا تھا غم جہاں کا حساب
آج تم یاد بے حساب آئے

❁❁❁

حرف سے فہم تک

مولانا نذیر احمد ندویؒ اور تعلیم کی داخلی فضا

سید حذیفہ علی ندوی (کیمبرج، برطانیہ)

مولانا نذیر احمد ندویؒ اُن اساتذہ میں سے تھے جن کے یہاں صرف معلومات نہیں ملتی، بلکہ مزاج تعمیر ہوتا تھا، مطالعہ وسیع، نظر دقیق، عربی و حدیث سمیت کئی علوم میں پختہ دسترس؛ مگر سب سے گہرا اثر اُن کی خشیتِ الٰہی، صفائے باطن اور طلبہ پر شفقت نے ڈالا۔ مجالسِ درس اور علمی نشستوں میں ایسی بے تکلفی ہوتی کہ قرب بھی محفوظ رہتا، ادب مجروح نہ ہوتا۔ میں نے ندوہ میں اُن کی صحبت میں پورے دس برس گزارے ان کی یہ قربت میرے لیے ایک مسلسل تربیت تھی، جو بعد کے برسوں میں میرے قلم میں ایک خاموش ترتیب بن کر سانس لیتی رہی۔

یہ قبولیت کی نشانی ہے کہ انہوں نے انتقال کے روز بھی حسبِ معمول چند اسباق پڑھائے اور پھر رخصت ہو گئے، یوں لگا کہ زندگی کا دھاگا آخری لمحے تک تدریس ہی سے بندھا رہا؛ ان کا جانا بہت کچھ کہہ گیا کہ جب علم کے ساتھ اخلاص جمع ہو تو چراغ آخر تک روشن رہتا ہے۔

زبان اُن کا خاص میدان تھا، وہ محض معلم نہیں، ذوقِ بیان کے معمار تھے، چار زبانوں میں مہارت نے اُنہیں ایسا باریک بین بنا دیا تھا کہ لفظ کے فقط معنی نہیں دیکھتے تھے بلکہ اس کا لہجہ، آہنگ، سایہ اور جملے میں بیٹھنے کی جگہ بھی پرکھتے۔ میں کبھی کسی عربی لفظ کا انگریزی متبادل پیش کرتا تو مسکرا کر فرماتے: ”قریب ہے، مگر اصل کیفیت نہیں آئی۔ ایک بار پھر سوچیے۔“ پھر دوسرا، تیسرا لفظ آتا تو کہتے: ”اب بات پوری ہوئی۔“ میں نے اُن سے سیکھا کہ ترجمہ صرف تقریبِ معنی نہیں، تہذیبِ معنی ہے؛ غلط متبادل پورے جملے کا مزاج بگاڑ دیتا ہے، اور درست لفظ اس میں جان ڈال دیتا ہے۔

عربی کی مشق کے لیے اُن کی ایک تمرین آج تک رہنما ہے۔ فرمایا کرتے: ”ایک عمدہ مضمون منتخب کیجیے، بار بار پڑھیے؛ پھر متن ہٹا کر یاد سے اسی اسلوب میں لکھنے کی کوشش کیجیے۔“ اس تقابل سے جو تعبیرات موزوں و رواں لگیں، اُنہیں جمع کیجیے اور اپنی عبارت میں اُن سے درستی پیدا کیجیے۔ یہ محض حافظے کی نہیں، ذوقِ عبارت کی تربیت تھی۔ اور یہی مشق سیکھنے والے کو صاحبِ قلم اور صاحبِ اسلوب بنا دیتی ہے۔

استشہاد میں اُن کی دیانت مثالی تھی، حوالہ اُن کے نزدیک محض صفحہ نمبر نہ تھا بلکہ امانت کی ادائیگی کا عنوان تھا، صحیح مقام، درست سیاق اور صرف بقدرِ ضرورت۔ درسگاہ میں بلند آواز سے قرأت کو وہ اعتماد کی تربیت سمجھتے تھے۔ طلبہ کے مسودات پر وہ اپنے ہاتھ سے اصلاح فرماتے؛ کہیں ایک لفظ بدل کر پورا مفہوم سیدھا کر دیتے، کہیں معمولی ردّ و بدل سے جملے میں تازہ سانس بھر دیتے۔

وقت دینے میں وہ سخاوت کے اُس معیار پر تھے جو اب کمیاب ہے۔ میں اکثر عشاء کے بعد اُن کے پاس بیٹھتا؛ کمرے میں ہوتے تو بسا اوقات خود چائے تیار کرتے اور اپنے ہاتھ سے پیش کرتے۔ یہ اُن کی دلآویز عادت تھی، سادگی میں شفقت، خدمت میں خلوص۔ انہی چھوٹی مجلسوں میں بڑی باتیں ہو جایا کرتی تھیں۔ سب سے پہلے وہ متن کی بنیاد درست کراتے، مقدمات کی ترتیب، سیاق کی درستی اور حوالے کی صحت پھر زبانوں کے درمیان پل باندھنا اور بیان کی تراش خراش سے متعلق اضافے فرماتے۔ برطانیہ آنے کے بعد برسوں میں اپنی تحریریں بغرض اصلاح ان کی خدمت میں بھیجتا رہا؛ وہ دو تین نشان لگا کر لوٹا دیتے، بات وہیں ختم، مگر عبارت میں نیا ربط اور قلم میں تازہ روانی آ جاتی۔

یہ ذوق کسی ایک فرد کی خاص دولت نہیں تھا؛ ندوہ کی علمی روایت میں زبان کا یہ شعور ایک قدیم اثاثہ ہے۔ میرے نانا ڈاکٹر اقبال احمد ندویؒ کہا کرتے تھے کہ مولانا ناظم صاحبؒ عربی ترجمے میں بے مثال مہارت رکھتے تھے، اور میرے چھوٹے نانا مولانا ضیاء الحسن ندویؒ نے مصر میں ایک موقع پر برجستہ انگریزی ترجمہ کیا تو حضرت مولانا علی میاںؒ نے بھرپور تحسین فرمائی، گویا روزِ اوّل سے ندوہ میں زبان کو محض اظہار کا وسیلہ نہیں، بلکہ فکر کی تشکیل کا ذریعہ سمجھا گیا۔ اسی لیے زبان کی صفائی دراصل فکر کی صفائی ہے، اور مولانا نذیر احمدؒ اسی میراث کو اپنے انداز سے تازگی بخشتے تھے۔

میری اُن سے آخری گفتگو بھی اسی محور پر رہی؛ میں نے عرض کیا کہ ”نظامِ تعلیم“ کو محض کتابوں کے نام سے کیوں پہچانا جاتا ہے؟ فرمایا: نصاب کا تازہ ہونا ضروری ہے، مگر نصاب زندہ تب بنتا ہے جب اس کے ساتھ روزمرہ کی مجلسیں، درست زبان اور امانت دار استشہاد جڑ جائیں، یہی تین سانسیں ہیں جن سے تعلیم میں گہرائی پیدا ہوتی ہے۔

نصاب کی گفتگو بھی اسی ربط سے کھلتی ہے، ہمارے یہاں بحثِ تعلیم اکثر کتابوں کی فہرست

اور امتحانی بندوبست تک محدود رہتی ہے، حالانکہ کسی درسگاہ کی اصل روح اُس داخلی فضا سے بنتی ہے جو استاد و شاگرد کی نشست سے لے کر راہداری تک پھیلی ہوتی ہے: سننے، بولنے کے آداب، اختلاف کی تہذیب، زبان کے استعمال میں احتیاط اور استشہاد میں دیانت۔ جہاں یہ فضا قائم ہو، وہاں کتاب بھی بولتی ہے اور سکوت بھی پڑھاتا ہے۔

مولانا کی مجلس میں یہی فضا سانس لیتی تھی۔ متن اُن کے سامنے محض معلومات کا مجموعہ نہیں رہتا تھا بلکہ گنجینۂ فہم بن جاتا۔ وہ سکھاتے کہ کہاں ٹھہرنا ہے، کہاں ربط جوڑنا ہے اور کہاں معنی کو خود کھلنے دینا ہے۔ اُن کے نزدیک لفظ کا شیوہ خدمت ہے، حکومت نہیں؛ نمائش کے بجائے صفائے مفہوم اور اختصار پسندی۔

استاد و شاگرد کے تعلق میں وہ حدِ اعتدال کے پاسدار تھے۔ سوال مختصر، جواب بقدرِ ضرورت؛ اختلاف میں نرمی، دلیل میں پختگی؛ شاگرد کے سوال کی حرمت اور جواب کی ذمہ داری؛ یہ سب اُن کے ہاں طریقِ کار نہیں بلکہ طرزِ زیست تھا۔ یہی فضا نصاب کے مواد کو زندگی کا اثر بخشتی ہے، دوام عطا کرتی ہے اور تعلیم کو محض معلومات سے اُٹھا کر شعور کا حصہ بنا دیتی ہے۔

اختتام پر، مولانا نذیر احمد ندویؒ نے ہمیں یہ سبق دیا کہ علم کی زندگی نیت کی صفائی، حوالے کی امانت اور اسلوب کی دیانت سے بنتی ہے۔ نصاب تب ہی مشعلِ راہ بنتا ہے جب استاد کی مجلس میں اخلاق کی گرمی اور زبان کی شفافیت ساتھ ساتھ چلیں۔ ربِّ کریم اُن پر رحمتیں نازل فرمائے اور ہمارے مدارس میں ایسی علمی فضا ہمیشہ قائم رکھے۔ آمین۔

آہ مولانا نذیرؔ ہم سب کے مولانا نذیرؔ!

ادیب الرحمٰن غزالی ندوی (کتب خانہ علامہ شبلی نعمانی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

تھے بہت سادہ مزاج اخلاق میں وہ بے نظیر
آہ مولانا نذیرؔ ہم سب کے مولانا نذیرؔ

خوش مزاج و خوش خیال و خوش ادا و خوش خصال
انکسار ان کی طبیعت میں میانہ ان کی چال

مقتدرِ عالم بلند اخلاق وہ معجز بیاں
انجمن در انجمن وہ کارواں در کارواں

فارسی، عربی زباں میں خوب حاصل تھا کمال
گفتگو میں اپنی وہ رکھتے تھے اردو کا جمال

کانوں میں رس گھولتا ان کا تکلم بے مثال
اتنے وہ شیریں زباں تھے اتنے وہ شیریں مقال

کیا ہی ان کے ملنے جلنے کا عجب انداز تھا
جن کے اِس انداز پہ سب کو بڑا ہی ناز تھا

تھے وہ طلبہ کے لئے استاد مشفق مہرباں
جذبۂ خدمت تھا جن کے ہر رگ و پے میں نہاں

درس بھی حسنِ عمل کا اِس نے ہم سب کو دیا
اور مزین خود کو بھی حسنِ عمل سے تھا کیا

تیرے جانے سے اداسی نے وہ پھیلایا ہے جال
چاہنے والوں پہ جس سے چھایا ہے حزن و ملال

سونی سونی سی لگی ہے سارے ندوہ کی فضا
دارِ فانی چھوڑ کر جب تم چلے دارِ بقا

ہے زمیں اب بھی وہیں پر آسماں اب بھی وہیں
پر نگاہوں کو ترے جیسا کوئی دِکھتا نہیں

ہیں سوالی نم یہ آنکھیں اور لبوں پر ہے فغاں
آہ ہم کو چھوڑ کر کے تم گئے آخر کہاں

آہ یہ کیسی ہے دنیا آہ یہ کیسا جہاں
دل کسی مومن کا بھی لگتا نہیں بالکل یہاں

دل کے زخموں کو ہمارے تازہ وہ کر جاتے ہیں
مسکراہٹ، نرم لہجے جب ترے یاد آتے ہیں

ہے دعا رب سے تمہاری اک الگ پہچان ہو
درمیانِ اہلِ جنت ایسی تیری شان ہو

آج بھی حق میں تمہارے ہے دعائے خاص و عام
تیری روحِ پاک کو پہنچے غزالیؔ کا سلام

زبان وادب کا درخشاں ستارہ

محمد ثاقب عالم ندوی (استاذ جامعۃ العلوم گڑھا گجرات)

ادب وفکر کی دنیا آج ایک عظیم خسارے سے دوچار ہے، علم وقلم کے درخشاں چراغ، ندوی فکر و ادب کا تابندہ ستارہ، صاحبِ طرز ادیب ڈاکٹر نذیر احمد ندویؒ بروز منگل ۷/ اکتوبر ۲۰۲۵ء کو داعیِ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ إنا للہ وإنا إلیہ راجعون۔

مولانا کی وفات نہ صرف اہلِ علم کے لیے صدمے کا باعث ہے بلکہ علمی وادبی دنیا کے لیے ایک عہد کے اختتام کی علامت بھی ہے۔ مولانا نے اپنی پوری زندگی علم، تحقیق اور اصلاحِ فکر ونظر کے لیے وقف کردی۔ ان کی تحریریں خلوص، بصیرت اور گہرے فکری شعور کا آئینہ تھیں، جو آنے والی نسلوں کے لیے رہنمائی کا سرچشمہ رہیں گی۔

دنیا علم وادب کے آفتاب اور ماہتاب سے کبھی خالی نہیں رہی، مگر بعض شخصیات ایسی ہوتی ہیں جن کے وجود سے زمانہ روشنی حاصل کرتا ہے، اور جن کے رخصت ہونے سے فضا میں ایک مستقل اندھیرا چھا جاتا ہے؛ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے جلیل القدر استاذ، ممتاز ادیب، ماہرِ انشاء وبیان، عربی زبان وادب کے عاشقِ صادق اور انگریزی وفارسی زبان کے شہ سوار مولانا نذیر احمد ندویؒ انہی ہستیوں میں سے ایک تھے۔ ان کے انتقال کی خبر نے علمی وادبی دنیا کو گہرے غم میں مبتلا کردیا۔ علم کے ایوانوں میں ایک خاموشی سی چھا گئی، اور اہلِ علم وادب کے دلوں سے ایک ہی صدا بلند ہوئی: إنا للہ وإنا إلیہ راجعون۔

استاذ محترم مولانا نذیر احمد ندویؒ کا شمار ندوۃ العلماء کے اُن ممتاز اساتذہ میں ہوتا ہے جنہوں نے عربی زبان کو نہ صرف ذریعۂ تعلیم بلکہ روحِ تربیت بنایا، ان کا مطالعہ وسیع، فکر عمیق، اور اندازِ بیان دل نشیں تھا، وہ جہاں تدریس میں مہارت رکھتے تھے وہیں تحریر وانشا کے میدان میں بھی ایک نمایاں مقام رکھتے تھے۔ ہم ان کی کلاس کو محض درسِ نحو یا بلاغت نہیں بلکہ ادب واخلاق کی محفل کہا کرتے تھے۔ ان کی زبان میں وہی شستگی تھی جو عربی کے ادیبوں کی شناخت ہے۔ وہ طلبہ کو صرف زبان وادب کے قواعد نہیں پڑھاتے تھے بلکہ الفاظ کے اندر چھپے حسن ومعنی کی روشنی دکھاتے۔ ان کی مجلس میں علم کے ساتھ ادب کی خوشبو بھی رچی بسی محسوس ہوتی۔

مولانا نذیر احمد ندویؒ ادب وانشا میں غیر معمولی مہارت رکھتے تھے۔ وہ فنِ تعبیر کے ایسے ماہر تھے کہ ان کی تحریروں میں بلاغت کی چمک اور فصاحت کی تازگی محسوس ہوتی۔ ان کا اسلوب سادہ مگر دل آویز، متین مگر مؤثر، اور علمی گہرائی سے بھرپور ہوتا۔ وہ لکھتے تو ہر جملہ معنی کی گرہ کھول دیتا، اور بولتے تو الفاظ گویا دل پر اترتے۔ عربی زبان ان کے لیے صرف علم کا وسیلہ نہیں بلکہ عشق وشوق کی ایک کیفیت تھی۔ وہ عربی میں سوچتے، بولتے، لکھتے اور جیتے تھے۔ ان کے نزدیک عربی زبان محض ایک لسان نہیں بلکہ قرآن وسنت کی زبان ہونے کے ناطے روحانیت اور نسبت کا درجہ رکھتی تھی۔

میرے لیے یہ سانحہ ذاتی دکھ کا بھی ہے، کیوں کہ وہ میرے نہایت مشفق استاذِ محترم تھے۔ میں نے ان کے زیر سایہ رہ کر علم کے ساتھ ساتھ ادب، وقار، اور شائستگی کا درس حاصل کیا۔ ان کی محفل میں بیٹھنا گویا کسی روحانی تربیت گاہ میں بیٹھنے کے مترادف تھا، ان کی گفتگو نرم اور پرسکون، ان کا طرزِ بیان متین، اور ان کی شخصیت سراپا شفقت تھی۔ وہ کم بولتے مگر جو کہتے وہ دل میں اتر جاتا۔ ان کی مسکراہٹ میں بھی تربیت تھی، اور ان کی خاموشی میں بھی نصیحت۔

مولانا مرحوم کا ہمارے جامعۃ العلوم، گڑھا (گجرات) سے نہایت گہرا تعلق تھا۔ حضرت وقتاً فوقتاً تشریف لاتے، اپنے قیمتی دروس ومحاضرات پیش فرماتے اور درسگاہ کی فضا میں اپنی موجودگی سے رونق بخشتے، طلبہ کی حوصلہ افزائی کرتے، اور اساتذہ کو قیمتی مشوروں سے نوازتے۔ ان کی آمد ہمارے لیے علم وادب کی بہار ہوتی، اور ان کی گفتگو گویا ایک چلتا پھرتا درسِ بلاغت لگتی۔

ہر ملاقات کے بعد دل یہی کہتا کہ ہم نے کسی استاد سے نہیں، بلکہ کسی چراغِ علم سے روشنی حاصل کی ہے۔

تقریباً ایک سال قبل آخری مرتبہ مولانا نذیر احمد ندویؒ جامعۃ العلوم، گڑھا گجرات میں تشریف لائے تھے۔ وہ لمحے ہمارے لیے سعادت اور افتخار کے تھے۔ کہ آپ تین روز تک جامعہ کی فضا میں رہ کر نہایت علمی وادبی انداز میں عربی زبان وادب کے دقائق پر روشنی ڈالی، اور اپنے علم وتجربے کے نچوڑ سے طلبہ واساتذہ دونوں کو فیضیاب فرمایا۔

آپ کے کلمات میں وہ جاذبیت، متانت اور شیرینی تھی جو صرف ایک سچے عالمِ ربانی اور استاذِ باکمال کے اندر ہی ہوتی ہے۔ آپ کی گفتگو نہ صرف علمی تھی بلکہ تربیتی بھی، جس سے دلوں میں علم کا احترام اور زبانِ عربی سے عشق بڑھا۔ آج جب

آپ ہمارے درمیان نہیں رہے، تو یہی یادگار لمحے دلوں کو بھگو دیتے ہیں، اور یہ محفل گویا عہدِ علم و اخلاص کا روشن منظر بن کر سامنے آتی ہے۔

جامعہ سے حضرت کو اتنی عقیدت تھی کہ جب آپ واپس ندوہ جانے لگے تو سامان سفر پورا تیار کرنے کے بعد جب جامعہ کے مہمان خانے سے نکلنے لگے تو میں نے کہا کہ مولانا کچھ چھوٹا تو نہیں؟ تو مولانا نے نہایت ہی محبت بھرا ایک جملہ کہا کہ: ”ثاقب صاحب! کچھ تو نہیں چھوٹا ہے ہاں مگر دل ضرور چھوٹ گیا ہے یہاں“!

مولانا نذیر احمد ندویؒ کی وفات سے نہ صرف دارالعلوم ندوۃ العلماء بلکہ پورا علمی و ادبی حلقہ ایک ایسے شخص سے محروم ہو گیا جو عربی زبان و ادب کا سچا خادم، اور نئی نسل کے لیے ایک زندہ مثال تھا۔ ان کے جانے سے ایک ایسا خلا پیدا ہوا ہے جو برسوں میں بھی پر نہیں ہو سکے گا۔ ایسے لوگ وقت کے دھارے میں کم ہی آتے ہیں، وہ اپنے ساتھ علم کی روشنی، زبان کا حسن اور تربیت کی خوشبو لے کر جاتے ہیں۔ ان کی زندگی ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ علم کے ساتھ ادب، اور زبان کے ساتھ اخلاق لازم ہے۔ انہوں نے ہمیں سکھایا کہ معلم محض پڑھانے والا نہیں ہوتا، بلکہ ایک رہنما اور مربی بھی ہوتا ہے۔ آج وہ ہم میں نہیں رہے، مگر ان کی یادیں، باتیں ان کے اقوال، ان کی دعائیں اور ان کی علمی و ادبی میراث ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ وہ واقعی عربی زبان و ادب کے ایک درخشاں ستارے تھے، جو اپنی روشنی سے نسلوں کو منور کر گئے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے، ان کے درجات بلند کرے، اور ہمیں ان کے علم، ادب اور اخلاق کے نقوش پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

❁❁❁

سیرت طیبہ کے سلسلۃ الذہب کا نیا شاہکار

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رحمۃ للعالمین

تالیف: حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مدظلہ العالی

عہد حاضر میں محدثین ہند کی عظیم الشان روایات کے وارث و امین حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی دامت برکاتہم کی تصنیفی و تالیفی زندگی کی حاصل، سرور دو عالم ﷺ کی سیرت پاک سے روشنی اور رہنمائی کے لیے موجودہ عہد کے تقاضوں اور جدید انسانی معاشرہ و مزاج کی مناسبت سے حضور پاک ﷺ کی رحمۃ للعالمینی کی دلنشیں، دلنواز اور دلکش تشریح علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی سیرت النبی ﷺ کے سو سال بعد سیرت نگاری میں مجددانہ کارنامہ تین ضخیم جلدوں میں خیر و برکت کی حامل یہ سیرت مصطفی عرب و عجم کے اہل نظر کی داد و تحسین کے مطابق:

1 حضور ﷺ کی ذات اور سیرت پر لکھنے کا مطلب ہے کہ حرمین شریفین پر بھی قلم اٹھایا جائے، یہ وہ نکتہ ہے جسے ڈاکٹر تقی الدین ندوی نے اس کتاب میں خاص طور پر ملحوظ رکھا۔
(محمد رسول اللہ ﷺ رحمۃ للعالمین پر ڈاکٹر عبداللہ بن عبدالمحسن الترکی - سابق جنرل سکریٹری رابطہ عالم اسلامی، مکہ مکرمہ)

2 یہ سیرت پاک کے موضوع پر گراں قدر تصنیف ہے، میں اس کو شیخ ندوی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی خصوصی مہربانی اور فضل ربانی سمجھتا ہوں۔ (ڈاکٹر سعود بن ابراہیم الشریم - امام و خطیب مسجد حرام مکۃ المکرمہ)

3 یہ جامع انسائیکلوپیڈیا ہے، مشرق و مغرب میں پوری امت اسلامیہ کے لیے گراں قدر تحفہ ہے۔
(ڈاکٹر ابولبابہ طاہر صالح حسین)

4 یہ عظیم الشان کتاب جامعیت اور دلکشی میں بے مثال اور عظیم شاہکار ہے اور ایسی کتاب ہے جس میں افراط و تفریط دونوں انتہاؤں سے بچ کر اعتدال کا راستہ اختیار کیا گیا ہے، زبان عصر حاضر کے فہم کے مطابق ہے۔
(ڈاکٹر موفق بن عبداللہ - استاذ حدیث جامعہ ام القریٰ)

5 بنیادی خوبی یہ ہے کہ سیرت نبوی پر لکھنے کے لیے جن باتوں کا علم ضروری ہے اس میں صاحب کتاب کمال مہارت کے حامل ہیں۔ اس کے مطالعہ سے ایمان و عقیدہ کو مضبوطی حاصل ہوتی ہے۔ (مولانا سید محمد رابع ندوی)

دیدہ زیب کتابت بہتر مجلد خوبصورت سرورق کے ساتھ تین جلدوں کا مکمل سیٹ حاصل کرنے کے لیے جامعہ اسلامیہ مظفر پور اعظم گڑھ یوپی اور دیوبند اور ندوہ کے مشہور مکتبوں سے رابطہ کیا جاسکتا ہے۔

پتہ **جامعہ بُکڈپو** جامعہ اسلامیہ مظفرپور اعظم گڑھ یوپی
موبائل نمبر: 9450876465 9532829745
قیمت: 2000 خصوصی رعایت کے ساتھ قیمت: 750

NADWATUL-ULAMA
PO. BOX 93, TAGORE MARG, LUCKNOW
226007 U. P. (INDIA)

ندوة العلماء
پوسٹ باکس ۹۳، ٹیگور مارگ، لکھنؤ
۲۲۶۰۰۷ یوپی (ہند)

باسمہ تعالیٰ

Date 25th October 2025

تاریخ ۲۵/اکتوبر ۲۰۲۵ء

اہلِ خیر حضرات سے

اللہ تعالیٰ کا شکر واحسان ہے کہ حضرت ناظم صاحب ندوۃ العلماء مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی دامت برکاتہم کی سرپرستی میں ندوۃ العلماء اپنی علمی، دینی، تعلیمی وتربیتی خدمات انجام دے رہا ہے، اوران بیش قیمت اصولوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہے جن کے لیے ندوۃ العلماء کو قائم کیا گیا تھا، یعنی جدید زمانہ میں اسلام کی مؤثر اور صحیح ترجمانی، دین ودنیا کی جامعیت اور علم وروحانیت کے اجتماع کی کوشش، فتنۂ لادینیت اور ذہنی ارتداد کا مقابلہ، اسلام پر اعتماد اور اسلامی علوم کی برتری وامتیاز کا اعلان واظہار، دین حق سے وفاداری اور شریعت پر استقامت۔

آپ سے ہماری درخواست ہے کہ وقت کی اس ضرورت اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کی افادیت کو سمجھتے ہوئے پوری فراخدلی، فیاضی اور ہمت سے کام لے کر ان تمام کاموں میں بھرپور تعاون واعانت فرمائیں کہ ہندوستان میں دین کے قلعوں کی حفاظت کی اس سے بہتر کوئی سبیل اور اس سے زیادہ پائدار کوئی صدقہ جاریہ نہیں۔

لہٰذا آپ حضرات سے گزارش ہے کہ اپنے صدقات وعطیات چیک یا ڈرافٹ کے ذریعہ اور آن لائن ندوۃ العلماء کے مندرجہ ذیل اکاؤنٹ میں منتقل فرمائیں، ایسے نازک اور مشکل حالات میں ندوۃ العلماء کے ساتھ آپ کا تعاون نہایت اہمیت رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی کاوشوں کو قبول فرمائے اوران کو ہمارے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے، آمین۔

(مولانا) محمد عمار حسنی ندوی	(مولانا ڈاکٹر) سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	(ڈاکٹر) محمد اسلم صدیقی	(مولانا ڈاکٹر) تقی الدین ندوی
ناظر عام ندوۃ العلماء	مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء	معتمد مال ندوۃ العلماء	معتمد تعلیم ندوۃ العلماء

نوٹ: چیک/ڈرافٹ پر صرف یہ لکھیں:

NADWATUL ULAMA

اور اس پتہ پر ارسال کریں:

Nizamat office, Nadwatul Ulama,
Tagore Marge, Lucknow - 226007 (U.P.)

معطیان کرام! براہ کرم اپنے عطیات ارسال کرنے کے بعد مندرجہ ذیل نمبر

+91-8736833376

پر مطلع فرمانے کی زحمت کریں، اس سے دفتری کاروائی میں سہولت ہوگی۔

فجزاکم اللہ خیر الجزاء

NADWATUL ULAMA

عطیات	A/c No. 1086 3759 711
تعمیرات	A/c No. 1086 3759 733
زکوٰۃ	A/c No. 1086 3759 766

IFSC CODE : SBIN0000125 - STATE BANK OF INDIA, MAIN BRANCH, LUCKNOW

ONLINE DONATION LINK
https://www.nadwa.in/donation/

website : www.nadwa.in
Email : nizamat@nadwa.in

نوٹ: ندوۃ العلماء لکھنؤ کو دیا گیا تعاون سیکشن 80G انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہوگا